نگار

قیمت

۸ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگار بک ایجنسی

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عدر)

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲۔ افسانے ۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان اعلیٰ تخیل و رپاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے

قیمت چار روپیہ (للعہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی اشارہ الیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عدر)

علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۳۵ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے مع انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عمار علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہو اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہر

"نگار" جنوری ۳۷ء

(۱) "ڈرامہ اصحاب کہف"۔ یہ ڈرامہ مصری انشا پرداز توفیق الحکیم کی کتاب "اہل الکہف" سے ماخوذ و مقتبس ہے اور تنہا یہی ایسی چیز ہے جو آپ کے ذوق انشا و تمثیل کو آسودہ کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ (۲) اسکر وائلڈ کے خطوط جو اُس نے سارہ (مشہور ایکٹرس) کو لکھے تھے اور جو دنیائے ادب و انشا میں خاص مرتبہ کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ وائلڈ اپنے طرز انشا و ندرت بیان کے لحاظ سے یوروپ میں جس مرتبہ کا شخص شمار ہوتا تھا اُس کا اندازہ آپ ان خطوط سے کر سکتے ہیں (۳) مسئلہ خلافت و امامت" (از ناد خیال شیعی کے قلم سے) مسئلہ خلافت و امامت لاکھ قدیم و لاینحل سہی پھر بھی اس سلسلۂ تحقیق و جستجو میں بعض ایسی باتوں کے نکلنے کا امکان ہے جن سے مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو سکے چنانچہ اس سلسلہ کا یہ پانچواں مقالہ ہے اسکے بعض عنوان یہ ہیں:۔ مسئلہ خلافت کے مبادی مقدمات۔ نفس مسئلہ خلافت۔ مسئلہ خلافت کے فروع و جزئیات وغیرہ ———— صفحات ۱۴۴ ———— قیمت عہ علاوہ محصول

ایک ضروری اطلاع

تاریخ اسلامی ہند کی پہلی جلد "حملۂ بابر" تک اس مہینے میں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس جلد کا نہایت ضروری ضمیمہ علحدہ شایع کیا جا رہا ہے، یعنی ۱۵ھ (۶۳۶ء) سے لیکر ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) تک کی سلسلہ وار توقیت (Chronology)

یہ نقشہ یا سلسلہ وار تاریخی واقعات کا تختہ "نگار" کے ۸۰ صفحات کو محیط ہو گا اور پہلی جلد کے ساتھ اس کا حاصل کرنا ازبس ضروری ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا مفصل تاریخی انڈکس ہے جس سے فوراً یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کس تاریخ میں کونسا اہم واقعہ پیش آیا۔ اسی کے ساتھ سب سے بڑی خصوصیت ایک یہ بھی ہے کہ انگریزی اور ہجری سنہ دونوں مطابق کرکے درج کئے گئے ہیں۔

اس کی قیمت بہت کم یعنی معہ محصول بارہ آنے رکھی گئی ہے تاکہ تمام قارئین نگار جن کے پاس تاریخ اسلامی ہند کی پہلی جلد پہونچ چکی ہے اس کو آسانی سے حاصل کر سکیں

اس خیال سے کہ بارہ آنے کی رقم بھیجنے میں آپ کو فیس منی آرڈر دو آنہ زیادہ نہ ادا کرنا پڑے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سال آیندہ کے چندہ کے ساتھ بارہ آنے زیادہ بھیجدیجئے یا اجازت دیجئے کہ جنوری کے وی پی میں اس رقم کا اضافہ کر دیا جائے۔ اس طرح آپ کو بچت ہو گی۔ اس لئے براہ کرم جو صاحب اس کو پسند فرماتے ہیں وہ ذریعہ کارڈ اطلاع دیدیں، تاکہ جنوری کے وی پی میں یہ رقم بڑھا دیجائے۔ جن حضرات کی کوئی اطلاع نہ آئے گی ان کو وہی معمولی رقم کا وی پی روانہ کیا جائے گا۔ توقیت کا نمونہ دوسرے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

منیجر "نگار"

نمونہ (صفحہ اول)

توقیت

یعنی سلسلہ وار واقعات تاریخی کا نقشہ

سنہ ۱۵ھ (سنہ ۶۳۶ء) سے سنہ ۹۳۲ھ (سنہ ۱۵۲۶ء) تک

سنہ ۱۵ھ / ۶۳۶ء — عثمان بن ابی العاص ثقفی گورنر بحرین و عمان نے عہد خلیفۂ ثانی میں اپنے بھائی حکم کو بحرین میں مقرر کرکے حکم دیا کہ "ہندوستان پر حملہ کریں" اسی زمانہ میں دوسرا حملہ حکم نے بھروچ پر کیا - اور اپنے بھائی مغیرہ کو دیبل روانہ کیا جہاں انھوں نے دشمن کو شکست دی، چچ نامہ میں لکھا ہے کہ یہ شہید ہوئے۔

سنہ ۲۲ھ / ۶۴۳ء — عبداللہ ابن عمرو ابن ربیع نے کرمان پر حملہ کیا، اور پایۂ تخت کو لے لیا، سیستان کو زیر کیا، اور مکران پر حملہ کرکے مکران اور سندھ کی متحدہ افواج کو شکست دی۔ خلیفۂ ثانی نے دریائے سندھ کو عبور کرنے کی ممانعت فرمائی۔ محمد الشیرازی، سیستان کا فاتح عمرو ابن التیمی اور عبداللہ ابن عمر خطاب کو ظاہر کرتا ہے۔ اور مکران کا فاتح عبداللہ ابن عبداللہ ابن عثمان کو بتاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "زنبیل، مکران، اور سندھ دونوں جگہ کا حکمران تھا" بعض مورخوں نے ناموں میں اختلاف کیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ فتح سنہ ۲۳ھ میں ہوئی ہے۔

سنہ ۳۵ھ / ۶۵۵ء — عبدالرحمٰن ابن سمرہ کو گورنر عراق نے سیستان پر حملہ کرنے کے لئے مامور کیا - اس نے بُست (Bust) لے لیا اور کابل تک بڑھتا چلا گیا۔

سنہ ۴۴ھ / ۶۶۴ء — عبدالرحمٰن ابن شمر نے مرو سے کابل پر حملہ کیا، اور یہاں بارہ ہزار نفوس کو مسلمان کیا، اس فوج کا ایک افسر مہلب ابن سفرہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے مامور کیا گیا۔ یہ ملتان تک بڑھتا چلا گیا اور بہت سے قیدی لیکر خراسان آیا۔

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپے ششماہی تین روپے
ہندوستان سے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپے ششماہی پیشگی

نگار

ششماہی چندہ دینے والوں کو نگار کا جنوری نمبر
بوجہ اضافہ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۳۴ | فہرست مضامین دسمبر ۱۹۳۸ء | شمارہ ۶

ملاحظات	اڈیٹر	۴
نظیر اکبرآبادی کی غزل گوئی	لطیف الدین احمد اکبرآبادی	۹
کتابوں کی یونیورسٹی	سید محمد عبد العلیم	۳۷
مکتوبات نیاز	اڈیٹر	۴۳
سیاسیات یوروپ	اڈیٹر	۴۸
آمر جرمنی کی داستانِ عشق	خواجہ احمد فاروقی بی۔ اے	۵۳
باب الاستفسار	اڈیٹر	۵۷
منظومات	نبی احمد۔ سلام۔ وجد۔ کاوش۔ کیفی۔ نعیم	۶۰
اسلامی ہند	اڈیٹر	۲۵۹

اصلی برقی قوام (تمباکو کے خوردنی قیمتی فی تولہ عمر) جو قطعاً نزلہ نہیں پیدا کرتا شیخ خورشید علی پرفیومر نظیر آباد لکھنؤ کے پتہ سے مل سکتا ہے

ملاحظات

عالمِ اسلامی کا حادثۂ عظیم

وہ شخص جس کا نام ماں باپ نے مصطفےٰ رکھا تھا، لیکن ۔۔ رسہ میں پہونچکر اپنے ذہنی امتیاز کی وجہ سے مصطفےٰ کمال ہوگیا، جو درۂ دانیال کے معرکہ کے بعد مصطفےٰ کمال پاشا کہلایا، جس نے ۱۹۲۲ء میں یونانیوں کو شکست دیکر قوم سے غازی مصطفےٰ کمال پاشا کا لقب حاصل کیا اور جو آخر میں ان تمام امتیازات سے بلند تر ہوکر صرف اتاترک کہلایا، وہ آج دنیا سے منھ موڑ کر عالم اسلامی کو حد درجہ سوگوار و ملول چھوڑ گیا ہے۔

آسماں را حق بود گر خوں بہ گرید بر زمیں

کمال اتاترک اس دور کے انسانوں میں ایک معجزہ کی حیثیت سے ظاہر ہوا اور تھوڑی سی فرصت میں وہی سب کچھ کر گیا جو ایک "مردِ صاحبدل" کر سکتا ہے۔ ترکی قوم زوال و انحطاط کی جس منزل پر پہونچ گئی تھی وہ اسکے عالم احتضار کی منزل تھی اور کوئی صورت اس کے جانبر ہونے کی باقی نہ تھی، لیکن کسے خبر تھی کہ قدرت سالونیکا کے ایک معمولی سپاہی زادہ سے کار مسیحائی لینے والی ہے اور ٹھیک اسوقت جبکہ سرزمین ترکی کا ذرہ ذرہ وقفِ مایوسی ہوچکا تھا امیدوں کا نیا آفتاب طلوع ہوگا اور وہ بستی جو صدیوں سے محوِ خواب تھی دفعتًا بیدار ہو جائے گی۔

کمال اتاترک نے اپنی عسکری زندگی اسوقت شروع کی جب سلطنتِ ترکی کا شیرازہ درہم برہم ہوچکا تھا اور نوجوانانِ اتحاد و ترقی نے جنگ عظیم کے سلسلہ میں جرمنی کی طرفداری کا غلط فیصلہ کرکے اپنے ہاتھ سے اپنی گردن پر چھری پھیر لی تھی۔ مصطفےٰ کمال، انور بے کی اس پالیسی کا سخت مخالف تھا اور وہ اس کو خودکشی کہتا تھا، لیکن اُسوقت تو ساری دنیا اس کی دشمن تھی، خود ابنارِ وطن اس کے مخالف تھے، ترکی کا ذرہ ذرہ اس سے برہم تھا، لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری، اور چند خستہ حال ترک سپاہیوں کی مدد سے چناق میں برطانوی فوج کے چھکے چھڑا دئے اور جب سب سے آخر میں یونانیوں کو اس نے سرزمین ترکی سے نکالا ہے تو لائڈ جارج جن کے اشارہ سے یونان نے یہ سب کچھ کیا تھا، حیرت زدہ ہوکر رہ گیا۔

قوموں کی تعمیر کرنے والے دنیا میں اور بھی ہوئے ہیں لیکن مصطفےٰ کمال نے اس قوم کو قوم بنایا جو اپنی اجتماعی صلاحیت بالکل کھو بیٹھی تھی اور اسقدر جلد کہ عقل انسانی باور نہیں کر سکتی۔ ۱۹۱۹ء میں ترکی کی شکستگی و درماندگی کا یہ عالم تھا کہ برطانیہ اس کو اپنی سیادت میں لینے کی تمام طیاریاں کر چکا تھا، لیکن تین سال نہ گزرے تھے کہ ۱۹۲۲ء میں لاسین کے مقام میں اتحادیین کا ہاتھ پکڑ کر مصطفےٰ کمال نے وہی شرائط لکھوائے جو وہ چاہتا تھا اور ایشیار کوچک میں پھر وہی ہلالی جھنڈا لہرانے لگا، جس کی حفاظت کے لئے ترکی قوم اپنے لاکھوں فرزندوں کا خون بہا چکی تھی۔

کمال اتاترک کی غیر معمولی فراست و فطانت ثابت کرنے کے لئے صرف یہی ایک واقعہ کافی ہے کہ اس نے سب سے پہلے خلافت کا خاتمہ کیا اور شخصیت پرستی کی اس دیرینہ روایت کو مٹا کر رکھدیا جس نے تعلیمات اسلامی کے بالکل خلاف نہایت مکروہ قسم کی ملوکیت قائم کر رکھی تھی۔ لیکن اس نے صرف اسی پر قناعت نہیں کی، بلکہ قیام خلافت کے سلسلہ میں جتنے مہلک جراثیم وہاں پیدا ہو گئے تھے، ان سب کو اس نے ہلاک کر ڈالا۔ مساجد و خانقاہ کو علماء و مشایخ کے وجود سے پاک کیا، مذہبی اوقات کو جو مولویوں کی شکم پری کا ذریعہ تھے ختم کر دیا، تعدد ازدواج کو ناجایز قرار دیا، عورتوں کو چار دیواری سے نکالکر آزادی کی فضا میں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کا موقعہ دیا، رسم خط اور لباس بدل کر ممالک یوروپ کے ساتھ سیاسی مساوات کا جذبہ لوگوں میں پیدا کیا، تعلیم کو عام اور مفت کر کے قدامت پرستی کی تاریکی کو مٹایا، اپنی زبان کو تمام اس متعفن و بوسیدہ لٹریچر سے پاک کر دیا جو مذہب کے نام سے واہمہ پرستی پھیلاتا تھا، صنعت و حرفت، ذراعت و تجارت کے لئے نئی نئی راہیں کھولدیں اور جدید پایۂ تخت (انقرہ) تعمیر کر کے ترکی تاریخ کو نئی بنیاد پر استوار کرنا شروع کیا۔

حیرت ہوتی ہے کہ کمال اتاترک بارہ سال کی مختصر سی مدت میں وہ سب کچھ کیونکر کر سکا جو صدیوں میں بھی انجام کو نہیں پہونچتا اور تنہا کس طرح وہ اتنے بڑے کام کو پورا کر سکا جو اجتماعی قوت سے بھی اس خوبی کے ساتھ پورا نہیں ہو سکتا۔ دنیا جو چاہے کہے لیکن میں اسے معجزہ کہتا ہوں اور کمال اتاترک کو "صاحب معجزہ" ہی سمجھ کر اس کے مافوق الفطرت قوائے ذہنیہ کے سامنے سر عقیدت جھکاتا ہوں۔

کمال اتاترک اب نہیں ہے، لیکن اس کے کارنامے ہمیشہ باقی رہیں گے، اس کا جسم فنا ہو گیا لیکن اسکی پیدا کی ہوئی روح کبھی فنا نہ ہوگی۔ وہ اس زمانہ کا بطل اعظم تھا، اس دور کے ترکوں کا پیغمبر تھا، گمراہ قوموں کے لئے مشعل ہدایت تھا اور وہ سب کچھ تھا جو انسان کو "نیم خدا" بنا دیتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی اور آلۂ مکبر الصوت

آلۂ مکبر الصوت، لوڈ اسپیکر (Loud speaker) کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے آواز کئی گنا بلند ہو کر دور و نزدیک ہر جگہ پہونچ سکتی ہے اور مولانا اشرف علی صاحب کو آپ جانتے ہی ہیں، تھانہ بھون کے وہ عالم د

بزرگ ہیں جنھوں نے بہشتی زیور اور بہشتی گوہر لکھ کر عوام میں بہت شہرت حاصل کر لی ہے۔

آپ کی اور خصوصیات یہ ہیں کہ علم تفسیر و حدیث میں بھی آپ کو ملکۂ راسخہ حاصل ہے اور آپ کے مریدوں کا بہت بڑا حلقہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ کے پاس مسایل فقیہہ و غیر فقیہہ کے متعلق سیکڑوں خطوط روزانہ آتے ہیں اور آپ ان کا جواب دینے میں ہمیشہ اس تفقہ فی الدین سے کام لیتے ہیں جو دوسرے علماء میں کمتر پایا جاتا ہے اور فہم انسانی سے بشیتر دور ہوتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں آپ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ:۔

"آلہ مکبر الصوت" کے ذریعہ سے خطیب کی آواز کو تمام سامعین تک پہونچانا جایز ہے یا نہیں؟"

اس کا جو جواب مولانا نے دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

"ہر ایسی مباح چیز کا استعمال جس میں کسی مفسدہ کا احتمال ہو ممنوع ہے، چونکہ خطیب کی آواز کا سامعین بعید تک پہونچانا شرعاً غیر ضروری ہے اور اس آلہ کے استعمال میں احتمال فساد ہے اور لہو و لعب کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اس لئے اس کا ترک لازم ہے۔ پھر یہ تو اس وقت ہے جب خطیب سے مراد مطلق واعظ و لکچرار ہو لیکن اگر اس سے مراد جمعہ و عیدین کا خطیب ہے تو اس وقت چونکہ آواز کا سننا ضروری نہیں ہے اس لئے اس آلہ کو مسجد میں داخل کرنا احترام کے خلاف ہے اور تشبّہ ہے مجالس غیر مشروعہ کے ساتھ"

اسی کے ساتھ مولانا نے ایک نقلی دلیل بھی کلام مجید سے پیش کی ہے اور وہ یہ کہ:۔

"حق تعالےٰ نے ارشاد فرمایا ہے" ولا تسبوا اللذین یدعون من دون اللہ فیسبو اللہ عدوا بغیر علم"۔
(یعنی غیر مسلموں کے دیوتاؤں کو برا نہ کہو ورنہ اُن کے ماننے والے خدا کو برا کہیں گے) ۔ ہر چند دیوتاؤں کو برا کہنا نہ صرف مباح بلکہ ضروری ہے، لیکن محض اس مفسدہ سے بچنے کے لئے کہ خدا کو بھی گالیاں دیجائیں گی منع کر دیا گیا"

اس سے مولانا نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جب دیوتاؤں کو برا کہنا جو اتنا اچھا فعل ہے فساد کے اندیشہ کیلئے منع کیا گیا تو اندیشہ لہو و لعب سے تو مکبر الصوت کا استعمال بدرجۂ اولیٰ ناجایز ہونا چاہئے۔ میں نے مولانا کے جواب کی اصلی عبارت نقل نہیں کی ہے، لیکن اس کا مفہوم وہی ہے جو عرض کیا گیا۔ اب اس کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ کیا اس سے زیادہ ذہنی غلامی کی کوئی مثال اور مل سکتی ہے اور کیا اسی عقل و فراست کا نام شرع میں "تفقہ فی الدین" رکھا گیا ہے اور کیا ایسے علماء کی پیروی تہذیب و انسانیت کے لئے باعث ننگ نہیں؟

چونکہ مولانا نے اس مسئلہ میں عقل و نقل دونوں سے کام لیا ہے اس لئے آئیے ان دونوں کی حقیقت پر بھی غور کریں اور دیکھیں کہ ان سے اور کیا احکام و مسایل متفرع ہو سکتے ہیں

اگر مولانا کے جواب کا تجزیہ کیا جائے تو حسب ذیل نتائج اس سے اخذ ہوتے ہیں:۔

۱۔ جمعہ و عیدین کے خطبہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ لوگ اسے سنیں بھی، صرف ان کا اس جگہ موجود رہنا کافی ہے

۲- آلہ مکبر الصوت کا استعمال لہو ولعب ہے اور تشبہ ہے کفار کے ساتھ۔

۳- دوسرے مذاہب کے دیوتاؤں اور خداؤں کو بُرا کہنا نہ صرف مباح ہو بلکہ بعض حالات میں "مندوب" و مستحسن بھی ہے۔

سب سے پہلے شق اول کو لیجئے جس میں خطبہ کا سننا ضروری نہیں ہے۔ یہ بالکل درست ہو کہ از روئے فقہ جمعہ و عیدین کے خطبہ کا سننا ضروری نہیں ہے اور لوگوں کا اختتام خطبہ تک صرف وہاں موجود رہنا کافی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ ان مسایل فقیہہ میں سے نہیں ہے جو نصوص قطعیہ سے ثابت ہوئے ہوں، بلکہ صرف وقتی حالات کے تحت متفرع کئے جاتے ہیں اور وقت و زمانہ کے حالات کے لحاظ سے بدلے جا سکتے ہیں۔

اسلام کی روح جو اس کے تمام شعایر سے ظاہر ہوتی ہے صرف اجتماعیت ہے، پھر ظاہر ہے کہ بہترین اجتماعیت خیال و حرکت اور فکر و عمل دونوں کی اجتماعیت ہوا کرتی ہے اور اس کے بعد صرف عمل کی اجتماعیت، محض خیال کی اجتماعیت کوئی چیز نہیں کیونکہ اگر کسی جماعت کے افراد خیال کے لحاظ سے متحد ہوں اور عمل کے لحاظ سے متفرق و منتشر تو یہ بالکل بے نتیجہ بات ہوگی، اسی لئے اسلام نے زیادہ تر عمل پر زور دیا ہے لیکن اس نے فکر و خیال کی اجتماعیت کو نظر انداز نہیں کیا کیونکہ اگر قول و فعل دونوں ہم آہنگ ہوں تو اجتماعیت میں بہت زیادہ رسوخ پیدا ہو جاتا ہے۔

اگر جمعہ و عیدین کے خطبہ کا سننا قرونِ اولیٰ میں ضروری نہیں سمجھا گیا بلکہ صرف وہاں کی حاضری کافی قرار دی گئی، تو اس کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ نفس خطبہ کی اہمیت یا اس کے سننے کی افضلیت کے قایل نہ تھے بلکہ صرف اس بناء پر کہ انکے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہ تھا جو ہزاروں لاکھوں آدمیوں تک اس آواز کو پہونچا سکتے اور اس لئے بدرجۂ اقل صرف وہاں بیٹھے رہنے ہی کو ضروری قرار دیا تاکہ اس طرح کم از کم اجتماع کی ظاہری کیفیت تو باقی رہیگی اور اس سے لوگوں پر اثر پڑے گا۔ اگر حکم یہ دیا جاتا کہ جو لوگ خطبہ سن سکتے ہیں وہ بیٹھے رہیں اور باقی چلے جائیں تو اجتماعیت میں انتشار پیدا ہو جاتا۔

اب نفس خطبہ کو لیجئے کہ بجائے خود وہ ضروری ہے یا نہیں۔ اس سے مولانا تھانوی کو بھی غالباً انکار نہ ہوگا کہ خطبہ سے مقصود عوام کو تعلیم دینا ہے ان کے اخلاق درست کرنا ہے اور اگر حال کی اصطلاح میں ظاہر کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اپنے مقاصد کا پروپاگنڈا کرنا ہے، پھر ظاہر ہے کہ ایک خطبہ کا اثر اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کو سنا جائے، محض یہ منظر کہ مولانا اشرف علی صاحب دور ممبر پر کھڑے ہوئے اپنے چشم و لب یا ہاتھوں کو حرکت دے رہے ہیں اور ان کا کوئی لفظ ہمارے کانوں تک نہیں پہونچتا، نہ کوئی دلنشین منظر ہے نہ مفید۔ اس لئے خطبہ کی بہترین صورت یہی ہو سکتی ہے کہ تمام حاضرین اسے سن سکیں، اور اگر یہ کسی ذریعہ سے ممکن ہو تو اس کا اختیار کرنا نہ صرف اقتضائے عقل و مصلحت ہے بلکہ تعلیمات اسلامی کا اسلوب بھی یہی چاہتا ہے۔

اب دوسری شق کو لیجئے۔ مولانا کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ کسی ایسی چیز کا اختیار کرنا جو باعث فساد ہو یا

جس میں احتمال لہو ولعب ہو مناسب نہیں، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مکبر الصوت کونسا مفسدہ لہو ولعب پیدا کر سکتا ہے اگر مولانا اس کا استعمال صرف اس لئے مناسب نہیں سمجھتے کہ غیر مسلم اس کا استعمال کرتے ہیں اور اس طرح تشبہ بالکفار ہو جائے گا، تو پھر اس دلیل کی بنار پر انھیں خود بھی بہت سی باتیں ترک کر دینا چاہیے۔

مولانا ریل میں سفر کرتے ہیں، موٹر پر سوار ہوتے ہیں، بجلی کی روشنی میں نماز پڑھتے ہیں۔ ڈبل روٹی مکھن استعمال کرتے ہیں، کفار کی مشینوں کا بنا ہوا کپڑا پہنتے ہیں، خط وکتابت میں کارڈ ٹکٹ استعمال کرتے ہیں جن پر تصویر بنی ہوتی ہے، تار کے ذریعہ سے اپنے پروگرام کی اطلاع اپنے مُریدوں کو دیتے ہیں، ولایتی بنی ہوئی گھڑیوں کی مدد سے افطار و اسحار کے اوقات کی تعیین کرتے ہیں اور اسی طرح کی بہت سی وہ باتیں کرتے ہیں جن میں (انھیں کی دور از کار تاویل کی بنار پر) تشبہ بالکفار بھی پایا جاتا ہے، مفسدہ لہو ولعب کا اندیشہ بھی، لیکن حیرت ہو کہ مولانا ان سب کو تو جایز سمجھتے ہیں اور مکبر الصوت کے استعمال کو ناجایز بتاتے ہیں۔ لہو ولعب یا کسی اور مفسدہ کا احتمال ہر اچھی سی اچھی بات میں پایا جا سکتا ہو اور اسکا تعلق ہر شخص کی انفرادی نیت سے ہے۔ نماز سے زیادہ مقدس عمل کوئی نہیں، لیکن وہ بھی لہو ولعب ہو سکتی ہے، اگر کوئی شخص اس کو کھیل سمجھ کر کرے، قرآن شریف کی تلاوت ترتیل کے ساتھ نہایت اچھا فعل ہے، لیکن اگر اس سے کوئی موسیقی کا لطف اُٹھانے لگے تو وہ بھی لہو ولعب میں داخل ہو جائیگا۔ صدقہ و زکوٰۃ کے فضایل ظاہر ہیں، لیکن اگر اس سے مقصود محض نمود و نمایش ہو تو یہ بھی مفسدہ میں داخل ہو جاتا ہے، الغرض تشبہ بالکفار ایسی بات ہے جس سے مولانا خود بھی نہیں بچ سکے اور احتمالِ لہو ولعب ایسی وسیع چیز ہے کہ نماز روزہ بھی اس کے حدود میں آسکتا ہے چہ جائیکہ مکبر الصوت۔ اس لئے ایسے معاملات میں ہمیشہ افادی پہلو کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے اور ایک نئی چیز کو اختیار کرنے سے اس لئے باز نہ رہنا چاہئے کہ وہ اس سے پہلے نہ پائی جاتی تھی، دیکھنا یہ چاہئے کہ وہ ہمارے لئے مفید ہے یا نہیں اور اس سے جایز فایدہ اُٹھانے کی کیا صورت ہے۔ مولانا نے اپنے اسی فتویٰ میں جو دلیل نقلی پیش کی ہو، وہ نہ صرف اس لحاظ سے کہ اسکا کوئی تعلق مسئلۂ زیر بحث سے نہیں ہے بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ مولانا نے اپنی طرف سے بھی اس کے مفہوم میں اضافہ فرمایا ہو، بالکل ساقط الاعتبار ہے۔ مولانا نے کلام مجید کی جو آیت پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہو کہ دوسرے مذاہب کے دیوتاؤں یا خداؤں کو بُرا کہنا اسلام نے منع کیا ہو اور ساتھ ہی ساتھ اسکی وجہ بھی ظاہر کر دی ہو کہ اس سے فساد کا اندیشہ ہو، لیکن مولانا نے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ باطل معبودوں کو گالیاں دینا نہ صرف مباح ہو بلکہ بعض صورتوں میں افضل بھی ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ حضرت مولانا نے یہ استنباط کہاں سے کیا ہو اور اسکے اظہار کا کیا موقعہ تھا۔ میرے نزدیک تو پیش کردہ آیت سے قطعاً اسکی ممانعت کر دی گئی ہو اور ایسی صورت میں اسکو مباح یا افضل بتانا سراسر نصِ قطعی کی مخالفت ہو، ہو سکتا ہو کہ کلام مجید کی بعض آیات سے وہ اسکا جواز بھی ثابت کر سکیں، لیکن یہ جواز بالکل اسی قسم کی تاویلات بازدہ کا نتیجہ ہوگا جس قسم کی تاویلات سے مکبر الصوت کے استعمال کو ناجایز بتایا گیا ہے۔ یہ ہے ہمارے علمارِ کرام کی وہ قدامت پرستانہ ذہنیت اور کورانہ تقلید جس نے قوم کی قوم کو تباہ کر کے رکھدیا اور یہی ہیں وہ بُت جن کو توڑنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

نظیر اکبر آبادی کی غزل گوئی

اور

ان کا غیر مطبوعہ کلام

نظیر اکبر آبادی ان شعرا میں سے ہیں، جن کی عظمت امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے۔ نظیر اسوقت تک صرف نظم نگار کی حیثیت سے مشہور تھے اور ان کے رنگِ تغزل سے لوگ ناواقف تھے

ہمارے عزیز دوست جناب لطیف اکبر آبادی نے اُن کی غیر مطبوعہ غزلوں کو سامنے رکھ کر جو اتفاق سے انکے ہاتھ آگئی ہیں یہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے اور جس تفصیل کے ساتھ نظیر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے وہ اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے

لطیف صاحب کے سامنے نظیر کے متعلق اور بھی بہت سے کام ہیں جن کو وہ فی الحال خاموشی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی صاحب نظیر کے متعلق کوئی معلومات رکھتے ہوں تو براہ کرم اُن سے آگرہ کے پتہ پر مراسلت کریں۔

(اڈیٹر)

تمہید زندگی حرکت سے عبارت ہے، اُس کے کسی شعبے میں ٹھیراؤ آجانے کی مثال "بند پانی" کی سی ہے جس میں "بوئے فساد" آجاتی ہے۔ شعروادب زندگی ہی کا ایک شعبہ ہے، اُس کا بھی کسی ایک نقطے پر قایم رہ سکنا محال ہے۔ شعروادب اگر ترقی نہیں کرتا تو یقیناً پست ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ مسئلۂ ارتقا کے مطابق اُردو زبان میں ایسے ارباب کمال پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اُردو ادبیات کو صناعت کے درجے تک پہونچایا، مگر انھیں ارباب کمال میں وہ جوہر قابل بھی رونما ہونے لازمی تھے جو دوسروں کی طرح اپنے حال اور ماحول کا آلۂ کار نہ تھے، بلکہ اُن لوگوں میں سے تھے جو عمومیت اور تقلید سے بغاوت کرکے اپنی راہ الگ بناتے، اور اس طرح مستقبل کی زبان بن جاتے ہیں۔ چونکہ ایسے لوگ اپنے عہد سے مختلف ہوتے ہیں، اس لئے اُن کے معاصر اور معاشر اُنھیں سمجھ نہیں سکتے اور وہ مردود کردئے جاتے ہیں۔ لیکن جلد یا بدیر

وہ وقت آجاتا ہے جب اُن کے جوہر اور قابلیت کی قدر کی جاتی، اور اُن کی پرستش ہونے لگتی ہے۔ یہی زمانہ اُن افراد کا حقیقی عہد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جونسن نے ایسے ہی نفوس کے متعلق کہا ہے:۔

"ہر وہ شخص جسے لکھنا پڑھنا آتا ہے، قلم اُٹھا سکتا ہے اور اُٹھاتا ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کی کثرت، زبان کو اُسی صورت وحالت میں استعمال کرتی ہے، جس صورت وحالت میں کہ زبان اُنکے سامنے آتی ہے، یا جس صورت وحالت میں کہ وہ زبان کو پاتے ہیں لیکن اس کے برخلاف ایک فطین شخص زبان کو اپنے مقصود اور غایت کا ماتحت بنالیتا اور اپنی خصوصیت کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے اُسکے دماغ میں عندیات (Moods) کا جو ہجوم اور تواتر ہوتا ہے، اُس کے اندر جو احساس وخیال، تخئیل و آرزو، ہمرنگی وتضاد، رونما ہوتے رہتے ہیں، امتیازات وتصورات جو اُس کے لئے فطری ہیں، زندگی و آداب زندگی کے متعلق اُسکی رائے، تواریخ کے باب میں اُس کا فیصلہ، اُس کی جدت وظرافت (لغوی معنے میں) کی مشق اور اُسکی قابلیت وفرزانگی کا عمق، یہ تمام ناقابل شمار مخلوق اور خود اُس کے ذہن کی تپک، اُس کے دماغ میں متشکل ہوجاتی ہیں اور وہ ان سب کو مناسب الفاظ اور موافق زبان میں، اپنے مخصوص انداز بیان میں، پیش کرتا ہے۔ اُس کی یہ زبان اظہار اُس کے ذہنی بطون سے مشابہ اور اُسی طرح کی کثیر الاشکال ہوتی ہے، وہ ایسی زبان اختیار کرتا ہے جو اُسکی شخصیت کے زور کا قرار واقعی اظہار اور اُس کا عکس و پرتو ہوتی ہے"

عہد متاخرین تک اُردو ادبیات کی تاریخ میں صرف دو ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں جن پر جونسن کی یہ تعریف صادق آسکتی ہے یعنی نظیر اور غالب۔ ان دونوں نے عام مسلک کو ترک کرکے اپنے لئے نئی راہ پیدا کی اور دونوں ہمیشہ مطعون رہے۔ اُن کے زمانہ میں اُن کی قدر ہونا ناممکن تھا، اگر ہوتی بھی تو بالکل غلط بنیاد پر۔ لیکن اُن کا اصلی عہد بھی آگیا۔

باوجود تاخر، غالب کی قدر نظیر سے پہلے پہچانی گئی۔ یعنی غالب پچاس ساٹھ سال اور نظیر سو سال زمانہ مابعد کی زبان تھے۔ اس تقدم وتاخر کی وجہ شاید یہ ہو کہ جدید تعلیم نے فلسفیانہ خیالات کی قدر کرنا ہمیں پہلے سکھایا اور صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کا درس بعد میں دیا۔ اگست ۱۹۳۸ء میں "یوم نظیر" کی تقریب پر، دلی ریڈیو اسٹیشن سے میں نے ایک مختصر گفتگو میں میاں نظیر کی غزلگوئی پر روشنی ڈالی تھی، اس موقع پر اُسی موضوع کے متعلق تفصیلی اظہار خیال مقصود ہے۔ نظیر اسوقت تک جس بناپر مشہور ومعروف ہیں وہ اُنکی نظمیں ہیں، اور اُنکے متعلق مخالف یا موافق آرا کا مدار اُنکا وہی کلام رہا ہے جو مشاہدۂ فطرت یا مناظر قدرت کی شاعری سے موسوم ہے۔ نظیر کا غزلیہ کلام نشر واشاعت نہیں پاسکا۔ اس کی ایک توجیہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ اُن کی غزلگوئی اُن کی نظموں کی شہرت سے دب گئی اور دوسری یہ کہ اُن کا غزلیہ کلام عدم اشاعت کے باعث منظر عام پر نہ آسکا، اس لئے کہ اُن کے متداول کلیات میں پچیس کے قریب غزلیں شامل تھیں اور پروفیسر شہباز کو بھی جنھوں نے واقعتاً نظیر کو دوسرا جنم دیا، تقریباً سو غزلیں دستیاب ہوسکیں۔ لیکن سید عابد علی صاحب اکبر آبادی نے گزشتہ دس سال کی مسلسل جستجو کے بعد کچھ غیر مطبوعہ نظموں کے علاوہ غزلیہ کلام کا جو ذخیرہ فراہم کرلیا ہے، آج اُس کی تعداد چھ سو غزلوں سے اوپر ہے۔ سید صاحب نے حقیقتاً اُردو زبان اور نظیر کے معترفین پر زبردست احسان کیا ہے، لیکن قوم کی پست ہمتی کو دیکھتے ہوئے کیا امید ہوسکتی ہے کہ یہ مجموعہ یا اُس کا ایک عمدہ انتخاب ہی

طبع و اشاعت پا سکے گا؟ اس مضمون کی ترتیب کے وقت میرے سامنے نظیر کا ایک قلمی نسخہ ہے جس میں تقریباً دو سو غزلیں اور اسّی نظمیں شامل ہیں۔ نظموں میں اکثر مطبوعہ اور غزلوں میں بیشتر غیر مطبوعہ ہیں۔

اوائل عمر میں نظیر نے نادر گردی کا زمانہ دیکھا تھا اور زندگی کے تقریباً سو سال پورے کرنے میں ہندوستان کے قصر شہنشاہی کے بام و در گرنے کا نظارہ کیا تھا۔ امرا و شرفا کی خانہ ویرانی بھی دیکھی اور غاصبوں اور غداروں کا عروج پانا بھی۔ زندگی کے نشیب و فراز کے ان مناظر کا سامنے آنا اور زمانے کی اس سفلہ پروری سے دوچار ہونا، ہر صحیح الفکر انسان کو غور و تامل پر مجبور کر دیتا ہے نظیر کی حکیمانہ نظر نے عالم کی بے ثباتی اور زندگی کی حقیقت کو بے نقاب دیکھا۔ معلمی کے پیشے نے طبیعت میں قناعت اور استغنا پیدا کر دیا۔ شاہی درباروں کا طمع اور امیرانہ جاہ و حشمت کی قلعی اگر نظیر کے سامنے اس طرح نہ کھلتی تو شاید لکھنؤ حیدرآباد اور بھرتپور کے بلاوے مسترد نہ ہوتے۔ غرض نظیر حصول مال کی طرف سے بے پروا اور تحسین و آفرین سے بے نیاز تھے دولت سے نفرت، فلسفیانہ طبیعت کا اور شان و مرتبت سے بے پروائی، شاعرانہ بصیرت کا نتیجہ ہے۔ نظیر نے کسی کی حاشیہ نشینی قبول نہ کی، کیونکہ وہ خود طبیعت کے بادشاہ تھے۔ جب طبیعت اور مزاج کا یہ عالم ہو تو ایک شخص کا خوش خلق اور منکسر المزاج ہونا بھی فطری سی بات ہے۔ چنانچہ ان حالات و اسباب کا اقتضا یہی ہو سکتا تھا کہ میاں نظیر کی صحبت میں عام طبقے کے لوگ زیادہ نظر آئیں۔ ماحول کا اثر مسلم ہے۔ نظیر کے شعری الکساؤ نے وہی موضوع منتخب کئے جو عام دلچسپی اور لگاؤ کی چیز تھے اور وہی انداز اختیار کیا جو عام فہم ہو سکتا تھا۔

نظیر کا انتخاب موضوعات ایک خاص نکتہ ہے جس کو سمجھ کر ہم ایک طرف تو ان کی تحریک شعری کی صداقت کو سمجھ سکتے ہیں اور دوسری طرف خود اُنکے نفس و مزاج کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے موضوعات شعری کی نوعیت پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نظیر گو طبقۂ متوسط سے متعلق تھے جو سماجی قوانین کی جکڑ بندیوں میں زیادہ اُلجھا ہوتا ہے، لیکن اپنے رجحان شعری کے مقابلہ میں وہ اپنے سماج سے ایک ذرہ بھر مرعوب نہ تھے۔ اُن کی شاعری اُن کی طبیعت کا تقاضا تھا جس میں اُن کی فطرت جھلکتی تھی۔ شاعری ان کے لئے وجہ تفاخر یا ذریعۂ معاش نہ تھی۔

ایک حقیقی شاعر کی داخلی زندگی اُس کے شعر میں پوری طرح منعکس ہوتی ہے، لیکن کسی شاعر کے کلام سے اُسکی خارجی زندگی مرتب کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ رہن سہن کا طریقہ یقیناً اتنا دلچسپ نہیں ہو سکتا جتنا رہن سہن کی آرزو اور احساس دلچسپ ہو سکتے ہیں، کیونکہ وہ اصل شاعر ہوتا ہے۔ ایک شاعر کا اپنا کردار جس قدر اُس کے جذبات میں جھلک سکتا ہے اُتنا افعال میں نمایاں نہیں ہوتا کیونکہ اکثر جذبات فعل کی صورت اختیار کرنے سے رہ جاتے ہیں۔ لیکن ایک سچا شاعر فکراً و حساً اور عملاً و فعلاً مختلف نہیں ہوتا۔ چنانچہ نظیر کی داخلی و خارجی زندگی، یعنی اُنکے جذبات و حسیات اور فعل و عمل میں شدید قسم کی مطابقت پائی جاتی ہے۔ اور چونکہ میاں نظیر زندگی کے نقاش ہیں اور زندگی بھی سامنے کی، یہی سبب ہے کہ اُن کے یہاں مقامی رنگ اس کثرت اور اس خصوصیت کے ساتھ نظر آتا ہے۔

نظیر کی مبتذل گوئی

میاں نظیر کی شاعری کے متعلق اظہار خیالات سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اُن کی ابتذال نویسی کی حقیقت پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ جہاں تک نفسِ اعتراض کا تعلق ہے، میری نظر سے اور بہت سے شعرائے فارسی و اُردو کا ایسا ہی کلام گزرا ہے، پھر تعجب ہے کہ صرف نظیر ہی ہدفِ ملامت بنانے کے لئے کیوں چھانٹا گیا؟ میں جس نتیجہ تک پہونچ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ابتذال کا لفظ بہت ہی محدود معنے میں نظیر کے کلام کی نسبت استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نظیر نے تقلید ترک کر کے تصنع سے بغاوت کی فطانت نے اُن کو حقیقی شاعری کا مسلک سمجھایا اور انھوں نے سامنے کے مظاہر زندگی کو اس طرح بیان کیا کہ عوام میں مقبول ہو گئے۔ چونکہ انھیں عوام سے سند قبول ملی، اس لئے لوگوں نے آنکھ بند کر کے اُن کے کلام کے پوچ اور مبتذل ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ یہ اُن کے عہد کے سماج کا قانون تھا کہ اجلاف جس بات کو پسند کرتے، اشراف میں معیوب سمجھی جاتی تھی۔

ممتاز اور قابلِ ذکر افراد میں سب سے پہلے نواب شیفتہ نے یہ اعتراض وارد کیا تھا۔ پھر مؤلفِ آبحیات نے نظیر کے استخفاف پر کمر باندھی اور اُن کے بعد مولانا شبلی نے شیفتہ کی رائے اور آزاد کے خیال کی تائید کی۔ آجکل کے بعض نوجوان "ادیب" بھی اسی رائے اور خیال سے متاثر ہو کر نظیر کو فحش گو اور مبتذل نویس کہتے ہیں۔

مجھے شیفتہ کی رائے سے کوئی تکرار اور حجت نہیں۔ اول تو وہ ذاتی رائے تھی، کہیں سے مستعار نہ تھی اور رائے آزاد ہے۔ دوسرے یہ کہ شیفتہ جس سماج کے فرد تھے اُس کے بازار میں امارت کی ٹکسال میں ڈھلی ہوئی شرافت کا سکہ چلتا تھا، اس لئے اُس عہد کا ادب بھی اُسی طبقے کے مزاج و مذاق کا آئینہ تھا۔ ادنیٰ طبقے "اجلاف" کے نام سے موسوم تھے جن کی زندگی نہ تھی کہ ادب میں جگہ پائے، یا جس کا ذکر ادب کہلائے۔ یہ بات چونکہ متانت یعنی امارت یا شرافت سے خارج تھی، اس لئے ادب سے بھی خارج تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ اُس عہد میں زندگی و ادب کے مابین تعلق کا خیال ہی کب پیدا ہوا تھا! لہٰذا شیفتہ کی رائے اُسوقت کے معاشری رجحان اور ادبی میلان کی پوری طرح آئینہ داری کرتی اور پلے کامل صداقت کے ساتھ پیش کر دیتی ہے۔ اُس زمانہ کا معیار شعر و شرافت نظیر کی شاعری پر یہی تنقید کر سکتا تھا

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کا خیال قابلِ افسوس ہے۔ وہ نئے رجحانات ادب کے مبلغ تھے۔ حیف ہے کہ اُنکے مذاق فطرت پرستی کو نظیر کے تمام سرمایۂ شاعری میں چند ہی شعر ایسے نظر آئے جو تیر کے کلام سے ٹکر کھاتے تھے!

لیکن یہ ماجرا بہت زیادہ افسوس ناک ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کی بالغ نظر بھی نظیر کی شاعری میں کوئی حسن و خوبی نہ دیکھ سکی اور وہ شیفتہ اور آزاد کے ہمنوا ہو گئے۔ حالانکہ مولانا کا زمانہ شیفتہ کے زمانہ سے مختلف تھا۔ جدید خیالات کافی طور پر پھیل چکے تھے۔ ادب اور صناعت کے نظریوں کی کافی اشاعت ہو چکی اور اُن میں وسعت آچکی تھی۔ شیفتہ کے عہد کی تنگ نظری باقی نہ تھی۔ مولانا خود جدید علوم پر نظر رکھتے تھے

میرا قیاس یہ ہے کہ مولانا نے نظیر کے کلام پر نظر ڈالے بغیر اپنے پیشروؤں پر اعتماد کیا۔ لیکن اس طرز عمل سے اُن پر

ایک غیر ذمہ دارانہ اظہار رائے کا الزام عاید ہوتا ہے اور شبلی سے عالم و فاضل کے لئے یہ ایک کمزوری ہے۔ بایں ہمہ شاید اس کی کوئی تاویل ہو سکتی، مگر اس کا کیا جواب ہے کہ اپنے قیام حیدر آباد میں مولانا نے پروفیسر شہباز سے یہ سن کر کہ وہ نظیر پر کچھ کام کر رہے ہیں، اُن کی اس سعی و کاوش کو فعل عبث سمجھا اور اگرچہ پروفیسر صاحب کی توجیہ کرنے پر مولانا نے اُن سے اتفاق رائے کر لیا، لیکن نظیر کے متعلق مولانا کی اصلی رائے "موازنۂ انیس و دبیر" میں موجود ہے اور اُس میں کسی ترمیم کا علم کم از کم مجھے نہیں ہو سکا ہے۔

گریجویٹ اُدبائے جدید کے اعتراض کی حقیقت بس اتنی ہے کہ پچھلے زمانوں کے مقابلہ میں آج کل انسانی مصروفیتیں چونکہ بہت زیادہ ہیں، نیز یہ عہد مشینی کہلاتا ہے، اس لئے کفایت وقت کی خاطر ہم اپنی بہت سی ضرورتیں "طیار" چیزیں خرید کر پوری کرنے میں سہولت دیکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سیاسیات قسم کے شعبوں میں اخبارات اور لیڈروں کی رائیں اپنا لینا شاید مضایقے کی بات نہ ہو، مگر زندگی کے ہر شعبے میں اس سہولت پر عمل کرنا بہت پر خطر ثابت ہو سکتا ہے

شعر کی بحث میں اگر لفظ ابتذال کا مفہوم کچھ وسیع اور نوعیت کچھ مختلف ہو جاتی ہے۔ معنوی ابتذال سے شاید ہی کسی شاعر کا دامن پاک رہا ہو، لیکن لسانی (لفظی) ابتذال بھی نہایت ثقہ شاعروں کے کلام میں موجود ہے۔ سعدی کی گلستاں کا باب پنجم خاص و عام کی زبان پر ہے۔ امیر خسرو کی مثنوی "عشقیہ" میں زفاف کی تفصیل، حکیم سنائی کی مذمتوں میں خواہر و دختر کی مذمت، اور صدہا شعرا کی ہجو و ہزل ہمارے سامنے ہے۔ چونکہ اکثر اور ثقات شعرا کے یہاں بھی ایسا ادب پایا جاتا ہے، اس لئے ہم یہی ایک نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ "واقعیت نگاری" سے قطع نظر، اس قسم کا کلام اظہار قدرت و کمال کے تحت عالم وجود میں آتا تھا اور جب یہ حال ہے تو تنہا نظیر کو مطعون کرنا کہاں کا انصاف ہو سکتا ہے؟

نظیر کے کثیر ذخیرہ شاعری میں چند نظمیں یا اشعار ایسے ہیں جن پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ لیکن اُن چند نظموں میں بھی دو چار ہی ایسی ہیں، جو کسی ادبی قدر کے بغیر پست ہیں، ورنہ باقی نظموں میں کوئی نہ کوئی ادبی قدر اور صناعتی قیمت پائی جاتی ہے۔ لیکن نظیر کے کلام پر نظر ڈالتے وقت ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ مطالعہ حیات کرنے والا شاعر ہے، اور یہ بھی فراموش نہ ہونا چاہئے کہ زبان کے مرتبہ کا موضوع کے رتبہ سے بلند و پست ہونا اصول فن کے خلاف ہے۔ پھر یہ بھی سامنے رکھنا ہے کہ آج کا نظریۂ صناعت موضوع کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کو مہمل سی بات سمجھتا ہے۔ اس باب میں صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا گیا ہے یا نہیں۔ آج شاعر کا مسلم منصب یہ ہے کہ جو موضوع اُس کی توجہ کو جذب کر سکے اور ایک شاعر میں وسعت نظر و خیال لازمی ہے۔ وہ کامل صداقت اور انتہائی صفائی سے اُس کا اظہار کر دے ایک شاعر اگر کسی مبتذل موضوع کا اظہار پوری صداقت اور کامل حسن سے کر دیتا ہے تو اُسے صناعت ہی کہا جائے گا

نظیر کی مبتذل گوئی کے ذیل میں ایک اہم اور واقعاتی نکتہ یہ ہے کہ اُن کے کلام کا ایک معقول جزو فرمایشی اور بدیہی ہے۔ منجملہ اور روایتوں کے آگرہ میں یہ بھی مشہور ہے کہ لوگ راہ چلتے میاں نظیر کے ٹٹو کی باگ پکڑ لیتے اور حسب حال شعروں

کی فرمایش کرتے تھے اور چونکہ وہ ہر شخص کے لئے قابل حصول اور فقیرانہ مشرب کے آدمی تھے اور انھیں کسی کی دلشکنی گوارا نہ تھی، فوراً کچھ شعر کہکر لوگوں کو ہنسا دیتے اور خوش کر دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ میاں نظیر کی حسن پرستی خود اُن کے کلام سے ثابت ہے۔ حُسن کی محفلوں میں جانے کا پروانہ میاں نظیر کے پاس بدیہہ گوئی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ چنانچہ اُن کی بعض نظموں سے صاف اور بین طور سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرمایشی ہیں اور فی البدیہہ کہی گئی ہیں۔ ایسا کلام لہجہ کے اعتبار سے بھی پست ہے اور اُس میں معائب شعری بھی موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ عوام کی یا بازار حسن کی فرمایشیں پوری کرنے میں، نظیر نقائص شعری دور کرنے کے لئے جان نہ کھپاتے ہوں گے اور ہنسنے ہنسانے کے لئے لہجے میں عمداً عامیانہ انداز رکھتے ہوں گے۔ چنانچہ اُن کے ایسے کلام کو اُس کلام سے جو شاعرانہ تاثر کے تحت وجود میں آیا ہے، بآسانی تمیز کیا جا سکتا ہے۔ بایں ہمہ اُن کی زیست نگاری کی خصوصیت دونوں طرح کی شاعری میں نمایاں رہتی ہے۔

نظیر کے معترض اگر مجموعۂ کلام کو غور سے دیکھتے تو زبان کا اختلاف معیار دیکھ کر اُن کو خود بخود نظر آجاتا کہ "کنہیا جی کا بالپن" اور "شیخ سلیم چشتی"، "آدمی نامہ" اور "بھنگ کا پیالہ"، "خربوزے" اور "عشق کی ہمہ گیری" کی زبان اور لہجے میں بہت بڑا فرق و امتیاز ہے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو نہ صرف یہ کہ وہ اپنے اعتراض کا جواب پا لیتے بلکہ اُن پر نظیر کا کمال فن بھی آشکارا ہو جاتا۔

نظیر کی شاعری

کسی شاعر کے کلام پر تبصرہ کرتے وقت ہمارے یہاں بالعموم مضمون آفرینی، بندش کی چستی، تشبیہ کا حُسن استعارے کی خوبی، اور محاورے کی برجستگی وغیرہ دکھانے میں توجہ صرف کی جاتی ہے۔ میں اس روایتی طریقے کو ترک کر کے نظیر کی بعض ایسی خصوصیات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کروں گا جو سرسری مطالعہ میں نظر سے رہ جاتی یا عام نگاہوں میں نہیں آتی ہیں۔ مجھے یہاں یہ بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ میرا مقصود کلام نظیر کی تحسین ہے لیکن "تحسین" کا مفہوم "تقریظ" نہ سمجھنا چاہئے۔

فنی اعتبار سے نظیر کی شاعری میں فروگزاشتیں ہیں، لیکن بڑے بڑے مسلم الثبوت شعراء کے یہاں بھی ایسی فروگزاشتیں موجود ہیں۔ شکسپیر کے اغلاط اگر جایز قرار دئے جائیں تو اُن کی ایک جدا لغت تیار ہو سکتی ہے، وہٹ مین (Whitman) اگر "قانون بالذات" کا لقب پا سکتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ نظیر بھی مستثنیٰ نہ کئے جائیں۔ شعر کے بہت سے محاسن کو اس بناء پر مسترد کر دینا کہ اُس میں بعض شرطیں پوری نہیں ہوئی ہیں ایک غیر فلسفیانہ حرکت بھی ہے۔ نظیر کی فنی غلطیوں پر دوسرے مستند شعراء کی مثالیں دے کر پروفیسر شہباز نے ایک جامع بحث کی ہے اور ضروری نہیں کہ یہاں اس موضوع پر اس سے زیادہ بحث کی جائے۔

شیلے (Shelley) نے شعر کی ایک نہایت جامع تعریف کی ہے، وہ کہتا ہے کہ "شعر زندگی کا ہو بہو نقش ہے اور شعر میں زندگی کی خارجی صداقت کا اظہار ہوتا ہے"۔ بالفاظ دیگر شاعر اپنی صناعت میں فطرت انسان کی شکلیں بناتا ہے جو اُن افعال کے فنا ہو چکنے کے بعد بھی جن کی کہ وہ نقل ہیں، بصورت اعجاز باقی رہتی ہیں۔

نظیر فطری و حقیقی شاعر ہیں اور اُن کا تقلید سے بغاوت کرکے زبان سے اپنی غایت کے مطابق کام لینا اُنکو جونسن کے مطابق، ایک فطین شاعر ثابت کرتا ہے اور اس لئے کہ نظیر کی نظر وسیع ہے اور پوری زندگی اُن کے سامنے ہے، انسانی خوبیاں اور خرابیاں یکساں طور پر اُن کی شاعری کا مسالا ہیں اور وہ زندگی کے سچے نقشے کھینچتے ہیں، شیلے کی تعریف اُنھیں حقیقی شاعر بتاتی ہے۔

عام طور پر نظیر کی شاعری ایک چشمے کی مثال ہے۔ اُن کے شعر کی روانی چشمے کی سی روانی ہے اور جس طرح ایک چشمہ کا پانی کہیں گہرا کہیں اُتھلا ہوتا ہے، اور جہاں اُتھلا ہوتا ہے، وہاں تہ کے بلور پارے اور کہیں کہیں جواہر ریزے اپنی رنگینی و دلکشی نمایاں کرتے دکھائی دیتے ہیں، مگر چشمہ کا راگ ہے کہ برابر جاری ہے، بالکل یہی کیفیت نظیر کے کلام کی ہے

نظیر کے پاس شعر کے مسالے کی بہتات ہے۔ اُن کو اپنی شاعری کے موضوع اور مسالے سے کتنا گہرا تعلق اور انہماک ہے؟ وہ اُس سے کس قدر لطف و لذت حاصل کرتے ہیں؟ اس کا اندازہ کرسکنا دشوار ہے۔ ہم اُن کے کلام سے محسوس کرتے ہیں کہ میاں نظیر بسنت کے موسوم میں درودیوار، زمین و آسمان کو بسنتی دیکھ رہے ہیں، ہولی کے دنوں میں اُنکو عبیر، گلال اور زعفران کی بارش ہوتی دکھائی دیتی ہے، بھنگ اور شراب کے نشے میں چور چلے آرہے ہیں، بچوں کے ساتھ کھیلنے میں دنیا و مافیہا کو بھولے ہوئے ہیں، عورتوں کے لباس کی خوشرنگی اور زیور کی زیبائی اُنھیں مسرت کی بہشت میں پہونچائے دے رہی ہے، غرض تیج تہوار، میلے ٹھیلے، رسوم و تقریبات، اُن کے احساس کی نقاشی کے لئے آب و رنگ ہیں، اور اُن کے احساسات و اشارات کا یقینی ذریعہ بن جاتے ہیں۔ چونکہ اُن کے شعر کا مسالا زندگی فراہم کرتی ہے اسلئے اُن کے اظہار میں زندگی کی صداقت جھلکتی ہے۔ مسالے کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ ایک چیز کی تمام قسمیں گنوا، اور اُس کے متعلق اتنی تفصیل پیش کردیتے ہیں کہ بعض وقت یہی بات اُن کی تعبیر و بیان کو وہ بلندی نہیں ملنے دیتی جو ایجاز کلام سے حاصل ہوا کرتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ جن واقعات و اشیاء کا بیان کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اُن واقعات و اشیاء کی حسّی و جسمانی زندگی میں ڈوب جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ اُن کے انداز اظہار کو بھی اپنا لیتے ہیں اور یہی احساس کی معراج ہے نظیر جس طرح احساس کرتے ہیں اُسی طرح اظہار کرسکتے ہیں اور اس اظہار سے سننے یا پڑھنے والے میں بھی وہ احساس اُسی طرح پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ شاعر کے احساس میں مساویانہ شریک ہوجاتا ہے

فطرت پرستی نظیر کی فطرت ہے کسی وقت بھی وہ فطرت کا ساتھ چھوڑتے معلوم نہیں ہوتے۔ وہ جب کسی پرند کی چہکار سنتے ہیں، جب ستاروں کی جگمگاہٹ نظر آتی ہے، جب چاندنی چھٹکی ہوئی دیکھتے ہیں، جب دھنک نکلی ہوئی دکھائی دیتی ہے، تو وہ فطرت سے اُتنے ہی قریب ہوتے ہیں جتنا ابوالبشر اُسوقت ہوئے ہوں گے جب اشیاء و انواع نے اسماء کا جامہ نہیں پہنا تھا نظیر ہمیں اپنے سروش غیبی سے ہمکلام ہوتے سنائی دیتے ہیں وہ ہمیں یہ معلوم کرا دیتے ہیں کہ اُن کا ماحول اُن کے لئے ایک جذبہ کی صورت رکھتا ہے، وہ اُسے ایک طلسم زار کی صورت میں دیکھتے اور اُسے

ایک طلسم زار ہی کی طرح محسوس کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں

جان درنگ واٹر (John Drink Water) کے بقول شاعری دو غالب اثرات سے متاثر ہوتی ہے۔ ایک خود شاعر کی شخصیت سے اور دوسرے اُس زمانہ کی اسپرٹ سے نظیر کی شاعری میں اُن کی شخصیت کے زور کا قرار واقعی اظہار تو ہر جگہ کار فرما نظر آتا ہے، لیکن اُس عہد کی اسپرٹ کے عوض عہد مستقبل کی اسپرٹ زیادہ دیکھنے میں آتی ہے۔ نظیر کی فطانت کی یہی سب سے بڑی دلیل ہو سکتی ہے ا کیونکہ یہ بھی ایک مسلم بات ہے کہ ہر شاعر کے ذہن میں ایک نمونہ و مثال ضرور ہوتی ہے جس کے سانچے میں اُس کی شاعری ڈھلتی ہے۔ لیکن نظیر کے سامنے ایسا کوئی نمونہ نہ تھا۔ وہ مشاہدۂ فطرت تک صرف اپنی فطانت کے زور سے پہونچے، جذبات کو انقلابی شکل میں پیش کرنا اور عام زندگی کے تمام پہلوؤں سے اپنے شعر کا مسالہ حاصل کرنا اُنھیں فطانت ہی نے سکھایا۔ اس اعتبار سے نظیر کو غالب پر بھی فوقیت ہے۔

شعر نظیر کی نمایاں صفت بندش کی سادگی اور بیان و خیال کی روانی ہے، جو میر کی سادگی و روانی سے مختلف ہے بلا شبہ میر کا احساس مقابلتاً گہرا ہے، لیکن حسن تخلیق اور جمال کائنات کے اظہار میں اُردو کا کوئی شاعر نظیر کے مقابلہ میں نہیں لایا جا سکتا اس سے انکار نہیں کہ نظیر کے یہاں میر کی طرح نفسیات کے گہرے رازوں کا انکشاف نہونے کے برابر ہے لیکن نفسیات کا دائرہ جذبات محبت ہی میں محدود نہیں ہے۔ نظیر کے یہاں نفسیات کا انکشاف ہے اور مبادی نفسیات تو اُن سے کسی موقعے پر ترک نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ وہ عام انسانوں کے شاعر ہیں۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ نظیر نے غالب کی طرح فلسفہ کی گتھیاں نہیں سلجھائیں، لیکن نظیر فلسفۂ زندگی کے جسے انگریزی میں (Everyday Philosophy) کہا جاتا ہے، مفسر ہیں اور وہ اُن کے یہاں موجود ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ وہی وہ ہے۔ کیونکہ اُن کے پیش نظر سامنے کی زندگی ہے۔

نظیر کی نقاشیِ فطرت کے ضمن میں شعرائے مرثیہ کو خاص کر میر انیس کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن غور کرنے کے بعد واضح ہو جائے گا کہ نظیر اور انیس میں بہت بڑا فرق ہے، دونوں کا نقطۂ نظر ایک نہیں ہے۔ مرثیہ میں جو قدرتی مناظر ہمارے سامنے آتے ہیں وہ شاعر کے عشقِ فطرت اور اُس کے مشاہدے کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ بلکہ اُن کے لئے "روایتی بیانات" کا نام زیادہ موزوں ہے۔

نظیر کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر فیلن نے بمسوط اظہار خیال کیا، اور اُس کو سچی شاعری اور نظیر کو اعلیٰ پائے کا شاعر تسلیم کیا ہے۔ نظیر کی شاعری کے متعلق ایک خاص بات یہ اور کہنا ہے کہ کسی خاص پائے انداز کی شاعری کے پھلنے پھولنے کے لئے خاص ہی فضاء و ماحول کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ آزادی سے سانس لے سکے۔ مگر نظیر کے انداز شاعری کے لئے اُن کا زمانہ ناموافق تھا، اس لئے اُن کا مسلک شعر پھیل نہ سکا، اُس کا وقت اب آیا ہے۔ عصری رجحانات غمازی کر رہے ہیں کہ ادبی مستقبل نظیر ہی کے ہاتھ ہے۔ عہد حاضر واقعیت نگاری پر فریفتہ ہے، اور نظیر اُس سے بھی

بڑھکر فطرتیت (Naturalism) پر کاربند ہیں۔ نواب جعفر علی خاں اثر نے فطرتیت کے اعتبار سے نظیر کو اولیت کا مرتبہ دیا ہے۔

الغرض نظیر کا غزلیہ کلام دیکھکر ایک سخن سنج اس قطعی نتیجہ پر پہونچے گا کہ وہ غزل گوئی میں اپنے معاصر اساتذہ کے ہم پایہ اور فطرت یا زندگی کی نقاشی میں بالکل منفرد اور یگانہ تھے۔ نظیر کی غزل کا پیرایہ تو وہی ہے جو مروج تھا لیکن خیال و بیان کا انوکھا پن غزل میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔

نظیر کا تغزل

نظیر کے کلام میں تغزل کا رنگ، ضروری نہ تھا کہ علحدہ عنوان سے دکھایا جاتا، کیونکہ دوسرے عنوانوں کے تحت جو مثالیں آئیں گی اُن میں دیگر شعری خوبیوں کے علاوہ نظیر کے تغزل کا رنگ بھی نظر آجائے گا۔ تاہم یہ ظاہر کرنے میں کوئی ہرج نہیں کہ نظیر کے یہاں کافی تغزل ہے۔ وہ کہیں کہیں معشوقانہ انداز بھی اختیار کرلیتے اور مناسب حد تک شوخ و ظریف بھی ہوجاتے ہیں۔ اکثر غزلیں معاملے کی باتوں میں قطعہ بند ہوگئی ہیں یا مسلسل کہنی پڑی ہیں۔ اس جگہ چند شعر اور ایک پوری غزل اس خیال سے نقل کی جاتی ہے:۔

آیا جو مرے قتل کو کھینچے ہوئے شمشیر، کیا آن بھی واللہ
اسوقت کوئی لفظ مرے منھ سے نہ نکلا، جز حرف اہاہا

آغوشِ تصور میں جب ہم نے اُسے مسکا
لبہائے نزاکت سے ایک شور تھا بس بس کا

سو بار حریر اُس کا مسکا نگہ گل سے
شبنم سے کب اے بلبل پیراہنِ گل مسکا

اُس وقت جیسی نکلیں مری حسرتیں نظیر
اُن لذتوں کو دل ہی سمجھتا ہے یا حنا

لڑی، منھ سے نہ بولی، روٹھ بیٹھی، جھڑکیاں دے لیں
اُسے سب کچھ بن آتا ہے، مجھے کچھ بن نہیں آتا

ساقی بہار آئی اور جوش ہے گلوں کا
لا جام بھر کے، سن لیں، ٹک شور بلبلوں کا

پھر نظر دیکھیں اُس عہد شکن کی صورت
دیکھئے کون سا یارب وہ زمانہ ہوگا

ساقی بھی یوں جام لیکر رہ گیا
جس طرح تصویر ہو ساغر بکف،

قرار لینے کو جاتے ہیں ہم جب اُسکے پاس
زیادہ اور بھی ہوبے قرار آتے ہیں

ہر زخم پر ہے آہ کے بدلے صدائے واہ
کیا پر دلی ہے اس دل خانہ خراب میں

شوقِ دیدار ہے یا جذبۂ اُلفت ہے، غرض
کوئی تو ہے کہ جو کھینچے لئے جاتا ہے مجھے

مجھ پر ابرو کی یوں نہ کھینچ کماں
او، میں تیری کمان کے قرباں

داد تیرے بھی حسن کی دیتا
آج ہوتا اگر مہ کنعاں

ٹھنڈی آہیں جگر سے نکلیں ہیں،
اشک بھی متصل ہیں قطرہ زناں،

دم غنیمت ہے پھر کہاں اے دل
یہ ہوا سرد اور یہ آب رواں،

ایک طلسم زار ہی کی طرح محسوس کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں

جان ڈرنک واٹر (John Drink Water) کے بقول شاعری دو غالب اثرات سے متاثر ہوتی ہے۔ ایک خود شاعر کی شخصیت سے اور دوسرے اُس زمانہ کی اسپرٹ سے نظیر کی شاعری میں اُن کی شخصیت کے زور کا قرار واقعی اظہار تو ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے، لیکن اُس عہد کی اسپرٹ کے عوض عہد مستقبل کی اسپرٹ زیادہ دیکھنے میں آتی ہے۔ نظیر کی فطانت کی یہی سب سے بڑی دلیل ہو سکتی ہے، کیونکہ یہ بھی ایک مسلم بات ہے کہ ہر شاعر کے ذہن میں ایک نمونہ و مثال ضرور ہوتی ہے جس کے سانچے میں اُس کی شاعری ڈھلتی ہے۔ لیکن نظیر کے سامنے ایسا کوئی نمونہ نہ تھا۔ وہ مشاہدۂ فطرت تک صرف اپنی فطانت کے زور سے پہونچے، جذبات کو انقلابی شکل میں پیش کرنا اور عام زندگی کے تمام پہلوؤں سے اپنے شعر کا مسالہ حاصل کرنا انھیں فطانت ہی نے سکھایا۔ اس اعتبار سے نظیر کو غالب پر بھی فوقیت ہے۔

شعرِ نظیر کی نمایاں صفت بندش کی سادگی اور بیان و خیال کی روانی ہے، جو میر کی سادگی و روانی سے مختلف ہے بلاشبہ میر کا احساس مقابلتاً گہرا ہے، لیکن حسنِ تخلیق اور جمالِ کائنات کے اظہار میں اُردو کا کوئی شاعر نظیر کے مقابلہ میں نہیں لایا جا سکتا۔ اس سے انکار نہیں کہ نظیر کے یہاں میر کی طرح نفسیات کے گہرے رازوں کا انکشاف نہونے کے برابر ہے لیکن نفسیات کا دائرہ جذبات محبت ہی میں محدود نہیں ہے۔ نظیر کے یہاں نفسیات کا انکشاف ہے اور مبادیِ نفسیات تو اُن سے کسی موقعے پر ترک نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ وہ عام انسانوں کے شاعر ہیں۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ نظیر نے غالب کی طرح فلسفہ کی گتھیاں نہیں سلجھائیں، لیکن نظیر فلسفۂ زندگی کے جسے انگریزی میں (Everyday Philosophy) کہا جاتا ہے، مفسر ہیں اور وہ اُن کے یہاں موجود ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ وہی وہ ہے۔ کیونکہ اُن کے پیشِ نظر سامنے کی زندگی ہے۔

نظیر کی نقاشیِ فطرت کے ضمن میں شعرائے مرثیہ کو خاص کر میر انیس کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن غور کرنے کے بعد واضح ہو جائے گا کہ نظیر اور انیس میں بہت بڑا فرق ہے، دونوں کا نقطۂ نظر ایک نہیں ہے۔ مرثیہ میں جو قدرتی مناظر ہمارے سامنے آتے ہیں وہ شاعر کے عشقِ فطرت اور اُس کے مشاہدے کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ بلکہ اُن کے لئے "روایتی بیانات" کا نام زیادہ موزوں ہے۔

نظیر کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر فیلن نے مبسوط اظہار خیال کیا، اور اُس کو سچی شاعری اور نظیر کو اعلیٰ پائے کا شاعر تسلیم کیا ہے۔ نظیر کی شاعری کے متعلق ایک خاص بات یہ اور کہنا ہے کہ کسی خاص یا نئے انداز کی شاعری کے پھلنے پھولنے کے لئے خاص ہی فضا و ماحول کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ آزادی سے سانس لے سکے۔ مگر نظیر کے انداز شاعری کے لئے اُن کا زمانہ ناموافق تھا، اس لئے اُن کا مسلک شعر پھیل نہ سکا، اُس کا وقت اب آیا ہے۔ عصری رجحانات غمازی کر رہے ہیں کہ ادبی مستقبل نظیر ہی کے ہاتھ ہے۔ عہد حاضر واقعیت نگاری پر فریفتہ ہے، اور نظیر اُس سے بھی

بڑھکر فطرتیت (Naturalism) پر کاربند ہیں۔ نواب جعفر علی خاں اثر نے فطرتیت کے اعتبار سے نظیر کو اولیت کا مرتبہ دیا ہے۔

الغرض نظیر کا غزلیہ کلام دیکھکر ایک سخن سنج اس قطعی نتیجہ پر پہونچے گا کہ وہ غزل گوئی میں اپنے معاصر اساتذہ کے ہم پایہ اور فطرت یا زندگی کی نقاشی میں بالکل منفرد اور یگانہ تھے۔ نظیر کی غزل کا پیرایہ تو وہی ہے جو مروج تھا لیکن خیال و بیان کا انوکھا پن غزل میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔

نظیر کا تغزل نظیر کے کلام میں تغزل کا رنگ، ضروری نہ تھا کہ علحدہ عنوان سے دکھایا جاتا، کیونکہ دوسرے عنوانوں کے تحت جو مثالیں آئیں گی اُن میں دیگر شعری خوبیوں کے علاوہ نظیر کے تغزل کا رنگ بھی نظر آجائے گا۔ تاہم یہ ظاہر کرنے میں کوئی ہرج نہیں کہ نظیر کے یہاں کافی تغزل ہے۔ وہ کہیں کہیں معشوقانہ انداز بھی اختیار کرلیتے اور مناسب حد تک شوخ و ظریف بھی ہو جاتے ہیں۔ اکثر غزلیں معاملے کی باتوں میں قطعہ بند ہو گئی ہیں یا مسلسل کہنی پڑی ہیں۔ اس جگہ چند شعر اور ایک پوری غزل اس خیال سے نقل کی جاتی ہے:-

آیا جو مرے قتل کو کھینچے ہوئے شمشیر، کیا آن تھی واللہ — اسوقت کوئی لفظ مرے منھ سے نہ نکلا، جز حرف اہاہا

آغوشِ تصور میں جب ہم نے اُسے مسکا — لبہائے نزاکت سے ایک شور تھا بس بس کا

سو بار حریر اُس کا مسکا نگہ گل سے — شبنم سے کب اے بلبل پیراہنِ گل مسکا

اُس وقت جبینیں نکلیں مری حسرتیں نظیر — اُن لذتوں کو دل ہی سمجھتا ہے یا حنا

لڑتی، منھ سے نہ بولی، روٹھ بیٹھی، جھڑکیاں دے لیں — اُسے سب کچھ بن آتا ہے، مجھے کچھ بن نہیں آتا

ساقی بہار آئی اور جوش ہے گلوں کا — لا جام بھر کے، سن لیں، ٹک شور بلبلوں کا

پھر نظر دیکھ لیں اُس عہد شکن کی صورت — دیکھئے کون سا یارب وہ زمانہ ہو گا

ساقی بھی یوں جام لیکر رہ گیا — جس طرح تصویر ہو ساغر بکف

قرار لینے کو جاتے ہیں ہم جب اُسکے پاس — زیادہ اور بھی ہو بے قرار آتے ہیں

ہر زخم پر ہے آہ کے بدلے صدائے واہ — کیا پردلی ہے اس دل خانہ خراب میں

شوقِ دیدار ہے یا جذبۂ اُلفت ہے، غرض — کوئی تو ہے کہ جو کھینچے لئے جاتا ہے مجھے

مجھ پر ابرو کی یوں نہ کھینچ کماں — او، میں تیری کمان کے قرباں

داد تیرے بھی حسن کی دیتا — آج ہوتا اگر مہ کنعاں

ٹھنڈی آہیں جگر سے نکلیں ہیں، — اشک بھی متصل ہیں قطرہ زناں،

دم غنیمت ہے پھر کہاں اے دل — یہ ہوا سرد اور یہ آب رواں،

بوسہ لیجئے جو ہوکے دست و کمر | اتنی ہم میں کہاں ہے تاب وتواں
وہ دہن اور کہاں لب اپنے نظیر | وہ کمر اور کہاں یہ ہاتھ میاں

نظیر کی زبان و فرہنگ یہ بالکل صحیح ہے کہ شاعری کی زبان روزمرہ کی کاروباری زبان نہیں ہوسکتی، لیکن یہ بھی اُسی قدر مسلم ہے کہ حقیقی شاعر روزمرہ کی زبان سے ہٹ کر بہت دور بھی نہیں جاسکتا غالباً یہ ارسطو کا قایم کردہ اُصول ہے کہ زبان کا معیار موضوع کے رتبہ کے متعلق ہونا چاہئے۔ نظیر کی شاعری میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اُس کے معیار کا تنوع ایک ناطق استدلال ہے کہ یہ مختلف معیار سوچ سمجھکر اختیار کئے گئے ہیں

نظیر نہ صرف اُردو زبان پر عبور رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اُردو، بھاشا، پنجابی، پوربی اور مارواڑی زبانوں کے شعر اُن کی ایک غزل میں موجود ہیں، جس کا مقطع ہے:۔

کبھی تو ہنس کر شتاب آجا نظیر کی طرف بھی ٹک اے جاں
بنا کے سج دھج، پھرا کے دامن، لگا کے ٹھوکر، ہلا کے بالا

عام طور پر نظیر نے صادہ وصاف زبان میں شاعری کی ہے اور چونکہ نظیر کے خیال میں اُلجھن نہیں ہوتی اسلئے زبان میں بھی گنجلک نہیں آنے پاتی ہے۔ مخمور صاحب نے اپنی تالیف "روح نظیر" میں توجہ دلائی ہے کہ نظیر الفاظ کا استعمال اُسی طرح کرتے تھے جس طرح وہ الفاظ عام بول چال میں آتے تھے۔ یہ صحیح ہے، مگر اُسی حد تک جہاں تک کہ موضوع کا تعلق ہے۔ نظیر کے یہاں موضوع کی مناسبت و اختلاف سے بزار اور بازار، دوانہ اور دیوانہ وغیرہ کا استعمال ہوا ہے۔

الحاصل نظیر "جو بولو وہ لکھو" کے اُصول پر عامل تھے۔ رسالۂ مخزن کی ترقی کے زمانہ میں یہ آواز کان میں پڑجاتی تھی۔ لیکن الہلال اور پھر نگار نے اس گفتگو کو سوال کی حد سے ہی باہر نکال دیا تھا۔ اس زمانہ میں آکر اجتماعیت اور اشتراکیت کے خیالات نے پھر وہی آواز کانوں میں پہونچائی ہے، اور اُس سے زیادہ قوی استدلال کے ساتھ یعنی ادب کو قومی زندگی کا آئینہ ہونا چاہئے، اس لئے زبان کا معیار وہ ہو جسے زیادہ سے زیادہ باشندگان ملک سمجھ سکیں!

اِس اُصول و استدلال کے خلاف یہ کہا جائے گا کہ ادب عوام کے لئے نہیں ہوتا۔ ادب ثقافت (کلچر) کا نتیجہ ہے اور عوام میں ثقافت نہ ہونے ہی کے باعث وہ عوام کہلاتے ہیں۔ اس لئے ادب کو اگر عام فہم بنا دیا گیا تو وہ ادب نہیں رہے گا اور چاہے جو کچھ ہو جائے۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ ادب قومی عادات وخصایل کا آئینہ ہوتا ہے، تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ تقیف اقلیت پر قوم کا اطلاق نہیں ہوسکتا اور جو ادب اکثریت کی زندگی کو منعکس نہ کرے وہ صحیح معنے میں ادب کہلانے کا مستحق

نہیں۔ کم از کم اُسے قومی ادب نہیں کہا جاسکتا۔ چنانچہ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ ہمارے ادب میں قومی زندگی کا عکس نہیں ہے، تو یقیناً ہمیں چاہئے کہ اپنے ادب کی پیشانی سے یہ داغ دھونے کے لئے اُسے قومی زندگی سے قریب تر کردیں اور اگر ایسا کرنے میں نفاست یا ادبیت کا کچھ نقصان ہو بھی تو اُس کا خیال نہ ہونا چاہئے۔ اسلئے کہ ثقافت اور ادب یعنی زبان، ذی حیات عضو کہے جاتے ہیں۔ زبان کا معیار بدل دینے کے بعد بھی اُس میں نفاست و ادبیت پھر آسکتی ہے اور اس اضافے کے ساتھ کہ اُس کے اندر قوم کی زندگی بڑی حد تک رونما ہوگی اور قوم کا بڑا حصہ اُس سے فیض یاب ہوسکے گا، یعنی ثقافت حاصل کرسکے گا۔

اِس بحث کو ذرا پھیلا دینے سے میرا مقصود یہ بتانا تھا کہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے نظیر نے آگرہ میں بیٹھ کر ادب اور زبان کا یہی معیار قایم کیا تھا، درانحالیکہ حاتم کے وقت سے اُن الفاظ کو کاٹنے چھانٹنے کا عمل جاری تھا، جو عوام کی زبان پر چڑھ جاتے تھے۔ نظیر نے وہ زبان پھیلانا چاہی اور وہ ادب پیدا کیا جس کو ہماری اکثریت سمجھ سکتی اور جس میں ہماری اکثریت کی زندگی منعکس تھی۔ لہٰذا اس اعتبار سے کہ انھوں نے ایک قومی زبان اور قومی ادب پیدا کیا، ہمارے تمام شاعروں میں ایک نظیر ہی قومی شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔

جیسا میں نے ابھی عرض کیا، ہماری زبان میں ترک اور تراش کا عمل بہت جلد شروع ہوگیا تھا اور متقدمین کی اس تراش خراش کے عمل نے زبان کا دائرہ ہمیشہ تنگ رکھا اور بہت سے مفید و کارآمد الفاظ کو ساقط الاعتبار کردیا ——
اس سے انکار نہیں ہوسکتا اس طرزِ عمل سے اُردو نے شستگی و نفاست اور قابلیتِ اظہار کا بلند مرتبہ بہت تھوڑی ہی مدت میں حاصل کرلیا، لیکن توسیع زبان کا مسئلہ اپنی جگہ اٹل رہا اور ہے۔ متروکات میں اکثر ایسے سبک الفاظ پائے جاتے ہیں جن کے معنے وسیع اور مفہوم نازک ہیں اور جن کی ہمیں آج ضرورت ہے مگر وہ سکۂ اب رائج نہیں۔
اس دور کے بعض شاعروں اور ادیبوں نے اس بات کا احساس کیا ہے کہ پرانے الفاظ زندہ اور نئے الفاظ اور اسلوب وضع کئے جائیں۔ وہ اس طرف بھی مائل ہیں کہ زبان و عروض کی ناروا گرفتیں کچھ ڈھیلی کردی جائیں
نظیر نے اپنے زمانہ میں صرف کاٹ چھانٹ سے اعراض ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وسیع پیمانے پر اختراع و تصرف پر بھی بڑی دلیری سے عامل رہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو نظیر کی خدمت زبان اندازے سے باہر نظر آتی ہے۔ نظیر کا ذخیرۂ الفاظ تمام اُردو اہل قلم سے زیادہ ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ جب بھی ہم خلوص مقصد اور سنجیدگی مدعا سے توسیع زبان کے مسئلہ پر غور کرنے بیٹھیں تو اسالیب و الفاظ کا بڑا ذخیرہ حاصل کرنے میں کلام نظیر سے ہم کو بہت زیادہ مدد ملے گی
اگر موجودہ معیار پر جانچا جائے تو نظیر کے یہاں زبان کی غلطیاں ہیں وہ فارسی اور ہندی کے الفاظ عطف و اضافت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جیسے "جواں ولڑکے" یا "گھنگرو تال" وغیرہ، اوپر کہا جاچکا ہے کہ وہ عام تلفظ کا اتباع کرتے ہیں جیسے عجوبہ یا سرآنا (بجائے سرہانا) یعنی حروف گرادیتے ہیں۔ وہ ضرورت پر جمع الجمع بھی بنالیتے ہیں جیسے "عنایاتیں"

وہ قدیم الفاظ بھی استعمال کر لیتے ہیں جیسے "ستی" بمعنی سے، "سوتیاں" بمعنی سوتی ہیں، اور "ملونا" بمعنی ملانا۔

لیکن فارسی ہندی الفاظ کی ترکیب اُسوقت کے بعد تک کے شعراء کے یہاں پائی جاتی ہے اور پُرانے الفاظ کا استعمال بھی بالکل متروک نہ ہوا تھا۔ حروف گرا دینے کے باب میں میری اوپر کی توجیہ شاید زبردستی کی تاویل نہ سمجھی جائے گی۔ یعنی نظیر کے اُس کلام میں جو فرمائشی اور فی البدیہ ہے اور جو محض تفریح و تفنن طبع کے طور پر وجود میں آیا ہو یقیناً عروض کی پروا نہیں کی گئی ہے اور نہ صحت لفظی کا خیال رکھا گیا ہے۔ یہ فرو گزاشت اور ناہمواری اسی قسم کے کلام میں زیادہ نظر آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ چند مثالیں جو پیش کی گئی ہیں میرے نسخے میں اسی قدر مل سکیں اور اس لئے وہ قابل لحاظ بھی نہیں ہو سکتیں۔ بایں ہمہ، اعجوبہ سے الف گرا کر عجوبہ لکھنا میرے خیال میں اچھی جدت ہے اور اگر غور و فکر کے ساتھ ایسی کارآمد اور مناسب بدعتوں کو روا رکھا جائے تو شاید زبان کی وسعت و اصلاح کے لحاظ سے بھی مفید ہو۔

اس بحث میں اختراع و اشتقاق نظیر کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ہے۔ میاں نظیر لفظ گھڑنے میں کسی وقت تامل نہیں کرتے۔ خاص کر قافئے کے باب میں اُن کو مطلق پروا نہیں ہوتی کہ اُن کا سکہ ٹکسال باہر سمجھا جائے گا یا نہیں۔ بلکہ اُن کے تیور سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یا تو وہ کسی احتساب کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے یا اپنے تئیں اُس سے بالا، یا اپنے آپ کو ہر اجتہاد کا مجاز سمجھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے زبان کو وسیع کرنے کا خیال پس پشت بھی ڈال دیا جائے، تب بھی شاید اس سے انکار نہ کیا جا سکے کہ اُس طرزِ عمل کا یہ فایدہ (سہولت) کیا کم ہے کہ شاعر کو خیال کا خون نہیں کرنا پڑتا چنانچہ اس پہلو سے نظیر قافیہ کے بادشاہ ہیں۔ اُن کے بعد یہ مرتبہ انشاء کو حاصل تھا، یا پھر اس عہد میں اکبر الہ آبادی نے یہ خصوصیت پیدا کی تھی۔

زبان کو احساس یا خیال کے اظہار کا واسطہ ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور زبان کا ایسا صحیح استعمال جو اظہار خیال بخوبی کر سکے اپنی جگہ خود ایک صناعت ہے اور ایک مخصوص نوعیت کی صناعت۔ ہر فن و صناعت کے کچھ ضابطے اور قاعدے ہوتے ہیں اور اگر اُن کی پیروی کامل طور سے کر لی جائے تو نتیجۂ مطلوب مکمل ہوتا ہے۔ لیکن زبان کے استعمال کا ایسا کوئی ضابطہ و نظام نہیں۔ استعمال الفاظ کا فن دیگر فنون کی طرح اکتسابی نہیں اور استعمال الفاظ کی یہی خصوصیت ہے جس نے "اہل زبان" اور "زباندان" کی اصطلاحیں وضع کرا دیں۔ زبان کا صحیح استعمال مطالعہ، غور، اور مشق و مزاولت پر منحصر ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک فطری ملکہ ہے۔ اظہار کی سلاست بعض کو بعض کے مقابلہ میں زیادہ حاصل ہوتی ہے اور خوش بیانی و خوش کلامی ایک خداداد بات ہے۔ پھر یہ کہ نہ باندان ہو یا اہل زبان اور مطالعہ، غور اور مشق کتنی بھی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، یہ حد درجہ مشکل بات ہے کہ کوئی شخص ہمیشہ اور ہر وقت تمام سلسلۂ خیالات کو صحیح اور قطعی الفاظ میں ادا کر سکے، یا مختلف اور نازک احساس کو اُسی رنگ میں اور اُسی نزاکت کے ساتھ ہمیشہ بیان کر سکے۔

دوسرے یہ کہ زبان کا استعمال صناعت کا درجہ حاصل کر لینے کے بعد، زبان اظہار خیال کا واسطہ ہی نہیں ہوتی، بلکہ وہ پر پرواز بن جاتی ہے جس سے وہ خیال اڑنے لگتا ہے۔ نفسیات کے ماہر ہی بتا سکتے ہیں کہ انسانی فکر و خیال کے ارتقا و ظہور میں، اُن کو ذہنوں کے اندر مرتسم کر دینے میں اور اُن کو زمانہ مستقبل کے مطالعہ و غور کے لئے محفوظ کر دینے میں، زبان کو کتنا زبردست دخل ہے۔ صحیح و درست الفاظ کا استعمال سامع یا مخاطب کی قوت مدرکہ کو کس طرح بیدار، اُس کے ذہن و فہم کو کتنا طیار، اور اُس کے قلب کو کس درجہ آمادہ کر دیتا ہے!

زبان پر عبور رکھنے اور الفاظ کا صحیح استعمال کرنے کے پہلو سے دیکھا جائے تو نظیر ادبائے اُردو کی صف میں بہت آگے نظر آتے ہیں۔ نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی نے ڈانٹے اور نظیر کے ایک ہی نوع کے خیال کا مقابلہ کرکے بتایا ہے کہ محض استعمال الفاظ پر قدرت کی وجہ سے نظیر، ڈانٹے کے مقابلہ میں کیونکر سبقت لے گئے اور اُنکی تخئیل کس درجہ مکمل ہو کر سامنے آئی ہے۔

اسی بحث میں، میں ایک خاص مسئلے کی طرف بھی توجہ دلا دینا چاہتا ہوں۔ لکھنؤ کی زبان کا اتباع کرنے والے یوں تو ہندوستان کے ہر حصہ میں ملیں گے، لیکن بعض الفاظ و محاورات ایسے ہیں جو لکھنؤ سے باہر مشکل سے سُنے جائیں گے۔ اس سے غالباً انکار نہ کیا جائے گا کہ "فسانۂ عجائب" کی تصنیف سے قبل لکھنوی زبان ایک معیار کی حیثیت نہیں رکھتی تھی، یا کم از کم ایسی کوئی معیاری کتاب موجود نہ تھی۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ سرور اکبر آباد کے رہنے والے تھے اور چالیس سال کی عمر میں وطن چھوڑا تھا۔ چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ زبان آگرے سے لکھنؤ پہونچی۔ میاں نظیر کے یہاں وہ مخصوص الفاظ ملتے ہیں جو سرور کے یہاں ہیں اور آج بھی لکھنوی زبان کی خصوصیت بنے ہوئے ہیں۔ یہ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، تلاش سے زیادہ مل سکیں گی:-

لفظ "اُپی" کا استعمال "دیا سرمہ آنکھ میں وہ بلا، جیسے اُپی تیغ پہ باڑھ دھری"۔ یا اہلے گہلے کا استعمال "طرق جیسے ہے عشرت کے اہلے گہلوں کا"۔ یا زری کا استعمال:- "ہاتھ بڑھا کر جو لی میں نے زری پنکھیا"۔ یا شور بور کا استعمال:- "شور بور سارا، کپڑے تھے لال میرے"۔ یا پنہانا جیسے:- "مجھ زلف کے مارے کو نہ زنجیر پنہاؤ"۔ یا پہ بمعنی پر کا استعمال جو پہلے مصرع میں بھی موجود ہے، وغیرہ۔

نظیر کی لسانی و ادبی خصوصیات کے ذیل میں جو مثالیں پیش کی جائیں گی، وہ ہرچند کہ خاص عنوانات کے تحت ہوں گی لیکن اُن کی وجہ سے دیگر خصوصیات شعری اور محاسن ادبی بھی سامنے آجائیں گے جن پر علحدہ توجہ دلانا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

نظیر کی اختراعی مثالوں سے اُن کا کلام بھرا پڑا ہے، لیکن اُن کا وہ خمسہ جس کا عنوان "پری کا سراپا" ہے خاص چیز ہے۔ اُس کی چند ٹیپیں پیش ہیں، اسماء کی صفتیں کس قدر صحیح، مناسب و مخصوص اور کتنی شاعرانہ ہیں،

بیان و زبان کی نزاکتوں کو سمجھنے والے لطف اندوز ہوں گے :-

چتون کی دغا، نظروں کی کپٹ، سینوں کی لڑاوٹ ویسی ہے
گالوں کی دمک، خوبی کی جھمک، رنگوں کی کھلاوٹ ویسی ہے
بندوں کی ہلت، جھمکوں کی جھکت، بالی کی ہلاوٹ ویسی ہے
کفشوں کی کھٹک، دامن کی جھٹک، ٹھوکر کی لگاوٹ ویسی ہے
ٹھٹوں کی اُڑاوٹ اور غضب، قہ قہ کی ہنساوٹ ویسی ہے

غزل کے دو شعر اسی رنگ کے ملاحظہ ہوں :-

کدھر ہے آج الٰہی وہ شوخ چلبلیا ۔۔۔ کہ جس کے غم سے مرا دل ہوا ہے بے کلیا
سو یار آپ نہ آیا رقیب کو بھیجا ۔۔۔ ہزار حیف ہم ایسے نصیب کے بلیا

ظاہر ہے کہ نظیر نے ہندی الفاظ جو اُس وقت تک زبان میں کثرت سے شامل تھے، بلا تکلف استعمال کئے ہیں جیسے جنوں بمعنی افراد۔ ہندی تصریف سے بہت کام لیا ہے جیسے راجہ سے رجیرا وغیرہ اور ہندی ڈھنگ پر مرکب لفظ بنائے ہیں جیسے مہ رتن وغیرہ۔

نظیر نے الفاظ اور محاورات کے نادر و نفیس محلِ استعمال پیش کئے ہیں، اور اُن کو اپنی خصوصیت و غایت کے سانچے میں ڈھال کر مرضی کے مطابق کام لیا ہے :-

شرارت، شوخی، عیاری، طرح، پھرتی، دغا، چھلبل ۔۔۔ (اس مصرع میں طرح کا استعمال نادر ہے۔)
دل عبرتوں سے چھا گیا، خاطر ہوئی بس سہمگیں ۔۔۔ بولی نظیر عبرت سے رہ، کیا پوچھنے کی ہے جگہ
(ان مصرعوں میں عبرت چھانا اور عبرت سے رہنا مخصوص استعمال ہے)

کرتا ہے گلبازی کی یاں ایکدم میں گردوں گل جھڑی ۔۔۔ (گل جھڑی بمعنی خزاں یا نامساعدت اچھوتا بیان اور مخصوص ترکیب ہے)

جلی جہاں میں کسی کی نہ زیر بریانی ۔۔۔ (زیر بریانی بمعنی تہ دیگ نظیر کی ایجاد ہے)
کہ جس سبب سے تو پھرتا ہے اس قدر شیدا ۔۔۔ (شیدا پھرنا اچھوتا محاورہ ہے)
اُس حسن کا پڑا ہے کانوں میں جب سے جھنکا ۔۔۔ (حسن کا جھنکا یعنی شہرہ یا چرچا)
ہم سمجھ جاتے ہیں پیارے تری خاطر کی مروڑ ۔۔۔ (خاطر کی مروڑ عمدہ محاورہ ہے)
پہن کے ریجھنی پوشاک چھب دکھاتی ہے ۔۔۔ ("ریجھنی" پوشاک کی ایک نادر صفت ہے)
نیند اُچٹ گئی، کروٹ جل گئی، کاٹے نہیں کٹتی ہے رات ۔۔۔ (کروٹ جلنا کتنا پیارا محاورہ ہے)

کاجل ڈھلکا، سرمہ بگڑا، منھ میں پان ہوا پھیکا (تینوں محاورے نہایت پاکیزہ ہیں)
اُس کا نخرا یہ غضب دل کے تئیں چھل گیا (پیرایۂ بیان اور محاورہ خاص چیز ہے)
کیا تجھ سے نظیر اب میں جوانی کی کہوں بات اس پن میں گزرتی ہے عجب عیش سے اوقات
(پن کا یہ استعمال بالکل نیا ہے)

تونے چھوئی کیوں مری زیب بھری پنکھیا (زیب بھری خاص ترکیب ہے)
یا ۔ پوتڑوں میں لیٹے سو سو مزے بلسنا، (بلسنا to enjoy کے لئے ہمارے یہاں کوئی مفرد مترادف موجود نہیں ہے)

جو مجھ پہ آن پڑا دن سیاہ مت پوچھو (دن سیاہ کی ترکیب ندرت لئے ہے)
فارسی ترکیبوں کے استعمال میں بھی نظیر نے جدتوں سے کام لیا ہے :۔
سہی قامت، پری پیکر، مقطع وضع، خوش منظر (مقطع وضع، کم از کم آج نیا معلوم ہوتا ہے)
کل جو گورے تھے ہم کہنہ مزارستان میں (" ستان " کا استعمال آجکل کچھ نیا سمجھا جا رہا ہے)

پھر ان میں زیب فزا کہکشاں نگاری کی
وہ تو وہ پر اس کجی ذاتی کو دیکھا چاہیئے
کیا پُردلی ہے اس دل خانہ خراب میں
چوم لوں میں ابھی اُس شوخ پری وا کے لب
اُس رشک گلستاں کی ایک زیب شعاری نے

فارسی ترکیبیں نظیر کم استعمال کرتے ہیں، لیکن جہاں ہیں نہایت سبک و دل نشیں ہیں :۔

ہو نمایاں جس طرح ابر تنک میں آفتاب
یار مہ چہرہ اور شب مہتاب
شمیم زلف مشک افشاں، تغافل سو ستم ساماں
غرور اور ناز بے پایاں، مزاج اور طبع نازک تر
ادائیں سب فسوں آئیں، نہ چھوڑیں دل، نہ چھوڑیں دیں
فریب و عشوہ صلح آگیں، عتاب و غمزہ جنگ آور
ناز و ادا کی گرمیاں، غارت گر صبر و تواں
طور تکلم دُر فشاں، طرز تبسم شکریں

گوشِ گفتار طلب، دیدۂ دیدار طلب
زلفیں الم شام تھیں، رخ رشک سحر تھے

محاکات شعری کی چند نازک مثالیں :۔

ساقی نے سب کو جام دئے بھر کے بزم میں — ساغر جو ہم نے مانگا تو شیشہ ہلا دیا
کیا غضب تھی وہ ادا، آہ کہ چنچل نے شتاب — گونج کھلتے ہی جھجک کے جو سنبھالا بالا
جب ہلاتی ہے صراحی سی وہ گردن اپنی — نشۂ حسن کو کرتا ہے دوبالا بالا،
غرفے سے ہاتھ کھول کے اُس نے جو لیا کھینچ — بجلی سی کچھ چمک گئی، کافر بلا حنا
یہ برق ابر میں دیکھے سے یاد آتی ہے — جھلک کسی کے دوپٹے میں نورتن کی سی

اِس نقاشی میں نظیر نے ایک ایک لفظ سے تصویر بنائی ہے۔ انکار میں خالی شیشہ ہلا دینا ایک پورا مرقع سامنے پیش کر دیتا ہے۔ گونج کے کھل جانے سے جھجکنا عجیب منظر دکھا دیتا ہے۔ بالے کا ہلنا ایک تصویر بنا دیتا ہے حنائی ہاتھ کا دریچے کے اندر کھنچ جانا ایک نقش کھینچ دیتا ہے۔ ابر میں بجلی کی چمک کو دوپٹے کے نورتن سے تشبیہ دینا ایک نظارہ پیش کر دیتا ہے۔

اسم صفت وغیرہ کا نادر اور درست استعمال نظیر کی خصوصیت ہے، اور ہر چیز کے لئے اُن کے یہاں نام بھی الگ ملتا ہے۔

۱۔ ساق بلور، گلاوٹ میں ہر ایک ران پری
۲۔ یہ گلبدن، یہ شوخ، رنگیلی، ہری بھری
۳۔ کیا پوچھے ہے لے رنگ بھری ہو مست مہینہ پھاگن کا
۴۔ قمری کی سن نفیر، نہ بلبل کی سن صفیر،
۵۔ مور کا شور، فغاں غوک کی، جھینگر کی جھنکار

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، نظیر پر اعتراض وارد کرنے میں بڑی سہولت اس سے ہو گئی کہ اُن کا غزلیہ کلام لوگوں کے سامنے نہ تھا۔ نظیر کی متانتِ کلام، علوئے بیان، اور ہمواریِ زبان کی مثال پیش کرنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند پوری پوری غزلیں نقل کر دی جائیں، تاکہ کلام کے دوسرے پہلوؤں کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکے :۔

اُس کے شرارِ حسن نے شعلہ جو اک دکھا دیا — طور کو سر سے پاؤں تک پھونک دیا، جلا دیا
پھر کے نگاہ چار سو ٹھیری اُسی کے روبرو — اُس نے تو میری چشم کو قبلہ نما بنا دیا
میں ہوں پتنگ کاغذی، ڈور ہے اُسکے ہاتھ میں — چاہا اِدھر گھٹا دیا، چاہا اُدھر بڑھا دیا
میرا اور اُس کا اختلاط، کیا ہو، مثال ابر و برق — اُس نے مجھے رُلا دیا، میں نے اُسے ہنسا دیا

تیشے کی کیا مجال تھی، یہ جو تراشے بے ستوں — تھا وہ تمام دل کا زور، جس نے پہاڑ ڈھا دیا
شکوہ ہمارا ہے بجا، مفت بتوں سے، کس لئے — ہم نے تو اپنا دل دیا، ہم کو کسی نے کیا دیا،
سن کے ہمارا عرض حال، یار نے یک بیک نظیر — ہنس کے کہا کہ بس جی بس، تم نے تو سر پھرا دیا

کچھ اُسے شرم، کچھ ہے ہم کو حجاب — ہے نئی چاہ میں یہ طرفہ عذاب
کیوں نہ عشرت دو چند ہو جو ملے — یار مہ چہرہ اور شب مہتاب
زور کیفیتیں دکھاتے ہیں، — ساقیِ گلعذار و بادۂ ناب
کرتے ہیں تار تار جیبِ الم — تارِ قانون و بین و چنگ و رباب
وقت خلوت یہ ہم نے اُس سے کہا (ق) — اب تو ٹک منہ سے دور کیجے نقاب
بولی ہم تو ابھی اُٹھا دیں مگر — لائے کب آپ دیکھنے کی تاب
اور جب آ جائے غش تمھیں تو نظیر — پھر چھڑکنا پڑے گا ہم کو گلاب

بحرِ ہستی میں، صحبتِ احباب — یوں ہے، جیسے بروئے آب حباب
جس کو رقص و سرود کہتے ہیں — وہ بھی ہے ایک ہوائے خانہ خراب
حسن اور عشق جس کو کہتے ہیں — خطفۂ برق و قطرۂ سیماب
فرصتِ عمر، قطرۂ شبنم — وصلِ محبوب گوہرِ نایاب
سب کتابوں کے کھل گئے معنی — جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

مقطع کی معنوی خوبی تحسین سے بے نیاز ہے۔ کھل گئے معنی کا مفہوم شرح ہو جانا بھی ہو سکتا ہے اور بے حقیقتی کا آشکارا ہو جانا بھی۔ بالفاظ دیگر دل کی کتاب دیکھے بغیر کسی کتاب کا مفہوم واضح نہیں ہوتا، یا دیکھنے کے لایق ہے تو دل ہی کی کتاب ہے۔

میں ہوں اور مہر وشے ہے اور ساقی ہے اور بزم شراب — پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

جوشِ عشرت، دورِ ساغر، رقصِ خوباں، صحنِ باغ
قصرِ رنگیں، فرشِ زریں، وقتِ خلوت، جائے عیش
بوسہ بازی، ہمکناری، بے حجابی، سرخوشی،
گل فشانی، شادمانی، کامرانی، خرمی

دل کشائی، بادہ نوشی، ذوق مستی، بے خودی

اس طرح کی عشرتوں میں اب تو بیٹھا ہے نظیر — پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

نہ دن کو چین، نہ راتوں کو خواب آنکھوں میں — بھرا رہے ہے ترے غم سے آب آنکھوں میں
جدھر وہ دیکھے اُدھر صف کی صف اُلٹ دے ہے — بھری ہے شوخ کے ایسی شراب آنکھوں میں
تمہارے ہم تو قدیمی غلام بندے ہیں، — تمہیں نہ چاہیئے ہم سے حجاب آنکھوں میں
تھما نہ اشک، نہ نیند آئی، نہ پلک جھپکی، — بسا ہے جب سے وہ خانہ خراب آنکھوں میں
خدا کی بات، جنہیں بات بھی نہ آتی تھی — وہ اب کریں ہیں سوال و جواب آنکھوں میں
قسم ہے چشمِ گلابی کی تیری اے گل رو — کہ یاں کھنچے ہے پڑا نت گلاب آنکھوں میں
شتابی آن کے محبوبو بگڑیاں رنگ لو — نظیر لایا ہے بھر کر شہاب آنکھوں میں

آنکھوں میں شہاب بھر کر لانے اور دنیا کے حسینوں کو صلائے عام دینے کی کیفیت کا بیان تقاضائے ذوق کرتا ہے

جس وقت خواب ناز سے وہ چشم وا ہوئی — صد خستۂ خفتہ کی حاجت روا ہوئی
لا بوئے گل نہ کلبۂ احزاں میں اے نسیم — یہ کب ہماری روح کی راحت فزا ہوئی
یوں کارواں شباب کا گزرا کہ گوش زد — آواز پا ہوئی، نہ صدائے درا ہوئی
پوچھی نظیر ایک نے کل شکل وصل یار — ق — ہم نے کہا یہ اُس سے کہ کیا کہیے کیا ہوئی
جو شکلِ دور باش تھی روز نخست کی — اب بھی جو ہم گئے تو وہی برملا ہوئی

آخری شعر جس پائے کا ہے اہل ذوق سے مخفی نہیں، لیکن میرا تاثر ہے کہ صرف ایک یہی شعر نظیر کو بے نظیر شاعر کہلوانے کے لئے کافی تھا۔

جوانی کا ماتم کس شاعر نے نہیں کیا، اور کون متنفس اس کا احساس نہیں کرتا، لیکن اس قطعہ میں نظیر نے جس دلگداز مگر فلسفیانہ رنگ کا نوحہ کہا ہے اپنی جگہ بے نظیر ہے۔

اک دن دل اپنا عیش گذشتہ کو یاد کر — رہ رہ کے ہم سے مانگتا اُس کا۔۔
یعنی وہ کیا زمانۂ عشرت تھا اے نظیر — جس میں ہزار عیش سے میں کامیاب تھا
اب زار و ناتوان و ضعیف و نحیف ہوں، — نقش طلسم تھا وہ کوئی یا حباب تھا
اک جنبش مژہ میں وہ برہم ہوا طلسم — کیا کہیے اس کو اور مگر یہ کہ خواب تھا
جب ہم نے دل سے بھر کے دمِ سرد یوں کہا — جس میں مئے طرب سے تو مست و خراب تھا
ہیہات کیا بتائیں ہم اُس عصر خوش کا نام — اے غفلت انتما وہی عہد شباب تھا

تھی باغِ زندگی کی اُسی سے ہی آب و رنگ — دیوانِ عمر کا بھی وہی انتخاب تھا
اپنی تو فہم میں وہی ہنگامِ دل فروز — مجموعۂ حیات کا لب لباب تھا

ترتیب الفاظ کی موسیقی نظیر کا سارا کلام الفاظ کی موافقت و مناسبت یعنی خوش صوتی و ترنم سے مالامال ہے۔ وہ بالعموم بجتی ہوئی بحریں اختیار کرتے اور الفاظ کو اس ڈھنگ سے ترتیب دیتے ہیں کہ جلترنگ کا نقشہ کھنچ کر رہ جاتا ہے۔ الفاظ کو موضوع سے کچھ ایسی ہم آہنگی ہوتی ہے کہ مضمون کانوں سے نظر آنے لگتا ہے۔ صرف ایک غزل ہولی کے بیان میں پیش کی جاتی ہے، ورنہ نظیر کی یہ خصوصیت عام ہے:۔

ہولی کی رنگ فشانی سے ہے رنگ یہ کچھ پیراہن کا — جوں رنگا رنگ بہاروں میں ہو حال چمن اور گلشن کا
جس خوبی اور رنگینی سے گلزار کھلے ہیں عالم میں — ہر آں چھڑکواں جوڑوں سے ہے حسن کچھ ایسا ہی تن کا
لے جام لبالب بھر دینا پھر ساقی کو کچھ دھیان نہیں — یہ ساغر پہونچے دوست تلک یا ہاتھ لپک لے دشمن کا
ہر محفل میں رقاصوں کا کیا سحر دلوں پر کرتا ہے — وہ حسن جتانا گانے کا اور جوش دکھانا جوبن کا
اُس گلرو نے یوں ہم سے کہا کیا مستی و مدہوشی ہے — نا دھیان ہمیں کچھ چولی کا نا ہوش تمھیں کچھ دامن کا
جب ہم نے نظیر اُس گلرو سے یہ بات کہی ہنس کر اُس دم — کیا پوچھے ہے اے رنگ بھری یہ مست مہینا پھاگن کا

اِن اشعار کی وجدانی کیفیت اپنی جگہ، لیکن تیسرے کا معنوی کنایہ اور واقعیتِ حیات کا اشارہ وجد آفریں ہے۔

نظیر کا معشوق اُردو فارسی کی شاعری کی روایات قدیمہ کے خلاف نظیر نے اپنا محبوب عورت کو بنایا، اور بے تکلف تانیث کی ضمیر استعمال کی ہے۔ میں نے اس خاص نظر سے اُن کی دو سو غزلیں پڑھیں تو مشکل سے تین چار شعر ایسے ملے جن کا مخاطب امرد ہو سکتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اُس عیب کی جو نظیر کے یہاں خصوصیت سے مفقود ہے، جناب مخمور کو شاعرانہ تاویل و اعتذار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُن کی نظموں میں دو ایک جگہ اگر اس نوع کا بیان پایا جاتا ہے تو وہ حیات نگاری اور زندگی کی نقاشی کے ذیل میں ہے۔ ایسے بیانات کو نظیر کی ذات خاص سے متعلق کر دینا نقد و درایت صحیح کے منافی ہوگا۔ ہم ایک شاعر کے کلام سے اُس کی پسند و ناپسند، رغبت و نفرت کا اندازہ تو کر سکتے ہیں، مگر اُس کے ہر اظہار خیال کو اُس کا اصل کردار قرار نہیں دے سکتے۔ شاعر تو دوسروں کے تجربات و افتاد، احساس و جذبات کو بھی احساس کے ذریعہ سے اپنا بنا لیتا ہے۔ اس ذکر میں شاید یہ بتانا نتیجہ خیز ہو کہ نظیر کے یہاں ساقی کی شخصیت محبوب سے الگ بھی ہے، ہر چند کہ اُن کا معشوق بھی یہ رسم ادا کرتا ہے:۔

ساقی کو جام دینے میں اُس خوش نگہ کی، آہ — ہر دم اشارتیں ہیں کہ "اُس کے تئیں نہیں"

نظیر کا مطمح محبت فلسفۂ قدیم میں ایک یہ نظریہ بھی ملتا ہے کہ انسان اپنی روح کو ملوث کئے بغیر بھی جسم سے گناہ کر سکتا ہے۔ یعنی اگر جسم گناہ کرے تو لازمی نہیں کہ روح بھی ملوث ہو۔ نظیر کا غزلیہ کلام دیکھئے

سے خیال ہوتا ہے کہ غالبًا وہ اسی مسلک کے آدمی تھے۔ نظیر نے اپنی کامرانیوں کو "فطرتیت" کے پردہ میں بیان کیا ہے اور ذوقِ حصول و جرأتِ رندانہ کے مشرب کو سراہا ہے۔ لیکن جہاں کہیں محبت کے مسئلہ پر اپنے تاثرات وحسیات بیان کئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی محبت مطمحی اور مثالی تھی۔ یا پھر میاں نظیر کے سامنے روح وجسم کے جداگانہ متاثر ہونے کا نظریہ ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میاں نظیر کی "لذتیت" اور اُن کی مطمحی محبت دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہوں اور ایک درجہ طے کر لینے کے بعد دوسرے تک پہونچے ہوں۔ یہی زیادہ قرین قیاس ہے کہ ترقیِ عمر کے ساتھ نظریۂ محبت میں تغیر ہوا ہو۔ افسوس کہ کلام کی تاریخی ترتیب نہ ہونے کی وجہ سے ہم اس بات کو مدلل نہیں کر سکتے۔ الغرض اُنکی محبت کا مقصود "ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے" ہے۔ اُنھوں نے اپنے اس نظریئے کو مختلف پیرائوں میں ادا کیا ہے اور اسی کی تفسیر وتشریح کی ہے:۔

آگئے تھے سیر کرتے، تم کو دیکھا، خوش ہوئے
بس خدا حافظ ہے ہم اے یار رخصت ہو چلے

ایک جگہ اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ اصل عشق، عشق ذات ہے، عاشق صفات کو نہیں دیکھتا:۔

فقط جو ذات کے ہیں دل سے چاہنے والے
اُنھیں کرشمہ وناز و ادا سے کیا مطلب

محبت اگر حقیقی ہو تو عاشق کا دل بس جذبۂ پرستش اور احترام سے لبریز ہوتا ہے۔ ایک شعر میں نظیر نے اپنے جذبے کی پاکیزگی اور اپنے محبوب کی نزہت ہی کے مانند ایک پاکیزہ ندیم پیدا کیا ہے۔ وہ نسیم کو مخاطب کرکے اپنی محبت کو اُس کی محبت سے زیادہ مقدس ثابت کرتے اور کنایتًا اُس کی پیہم بوسہ بازی پر ایک طنز کر جاتے ہیں:۔

اُس کی جبین پاک پہ اس دم تک اے نسیم
کافر ہوں، گر پڑی ہو نگہ، بے وضو مری

محبت میں دل کی جراحتیں مسلّم ہیں اور منھ سے ایک آہ نکل جانا بھی بالکل فطری۔ نظیر خود کو ورائے بشریت ثابت نہیں کرتے۔ لیکن عشق کی وفا پیشگی کو بہر حال مقدم رکھتے ہیں:۔

اظہار ہم بھی کرتے احوالِ دل فگاری
شرم و فا گر اکدم دیتی زباں کو یاری

محبت میں مدارج ہیں، نظیر کو بھی عشق کے تجربات ہوتے ہیں اور وہ اپنے لئے ایک محفوظ نتیجہ نکال لیتے ہیں:۔

دل جس کو چاہتا ہے اُسے بھی خبر نہ ہو
اپنی تو فہم میں ہے یہی راہ سب سے خوب

نظیر فلسفۂ زندگی کے ماہر ہیں، وہ زندگی کے مختلف مظاہر کو سمجھتے ہیں، اس لئے عشق کا حاصل بھی جانتے ہیں کہ اُس کی انتہا بس ایک آہ دلگداز ہے۔ لیکن وہ اسے بھی پست سمجھتے ہیں اور مطمئن نہیں، کیونکہ اُن کی نظر میں یہ کمالِ عشق (یعنی ایک آہ) بھی طالب اثر ہے اور طلب اثر سے جو ایک تمنا ہے، عشق کو بلند ہونا چاہئے:۔

کمالِ عشق بھی خالی نہیں تمنا سے
ہے ایک آہ تو اس کو بھی ہے اثر کی طلب

محبت کی لذت کو نظیر اپنے ہی لئے رکھنا چاہتے ہیں، اور کسی کو اُس کی خبر دینا اُنھیں گوارا نہیں ہے:۔

لطف جو چاہت کے ہیں سو وہ جتانے نہیں
چاہ چھپی کیجئے تا کوئی جانے نہیں،

محبت کرنا اور یہ آرزو نہ کرنا کہ محبوب بھی ہمیں چاہے، بڑا درجہ ہے۔ لیکن محبوب کو یاد کرنا اور یہ چاہنا کہ وہ ہمیں یاد نہ کرے، انتہا ہے۔ نظیر اس آرزو میں کامیاب ہو کر اس خوش قسمتی کا اعلان کرتے اور خوش ہوتے ہیں:۔

خوش نصیبی مری اُلفت کی تو دیکھو یارو
یاد کرتا ہوں جسے میں، وہ بھلاتا ہے مجھے!

اس شعر میں نظیر نے خیال کو اُس بلندی پر پہونچا دیا جہاں پہونچا دینا خیال میں نہ آسکتا تھا۔

علم وحکمت

غزل کے شعر میں خصوصاً علمی مسائل کا بیان غیر موزوں سی بات ہے۔ لیکن شاعر اگر عالم بھی ہے تو ناممکن ہے کہ اُس کے شعر ایسے مسائل سے پاک رہیں۔ اُردو شاعری میں فلسفے کا بیان غالب کی خصوصیت ہے۔ مومن کے یہاں بھی مسائل حکمیہ کی کمی نہیں۔ میرا یہ مقصود تو ہرگز نہیں کہ نظیر کو بھی عالم یا سائنس داں کہہ کر پیش کیا جائے، کیونکہ اگر وہ ایسے ہوتے بھی تو شاعری کے لئے یہ چیز کوئی وجہ تفاخر نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ دکھلانے کے لئے کہ ایک شاعر میں جو بصیرت ہونا چاہئے وہ نظیر کو بخوبی حاصل تھی اور وہ اِن حقیقتوں تک پہونچ جاتے تھے، چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ نظیر اپنی اس حیثیت سے خود بھی باخبر ہیں۔ کہتے ہیں:۔

حکمت کا اُلٹ پھیر نہیں جن کی نظر میں
وہ کہتے ہیں غافل "یہ بقا ہے یہ فنا ہے"

آغاز حیات پانی سے ہے، نظیر اس نکتہ سے لاعلم نہ تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شاعر کا پانی "آب رخ" ہے:۔

آب رخ کیا، کہ اسی سے ہے حیات ہر شے
شاہد اس بات کی ہے حی من الما، کی صدا

سورج کی کرنیں زمین پر بسنے والی مخلوق کے ساتھ کیا کیا شعبدہ بازیاں اور کیسی کیسی سحر کاریاں کرتی ہیں؟ زندگی ارض کا مدار آفتاب کی شعاعوں پر کہاں تک ہے؟ یہ سب سائنس کے مسلمات ہیں یہ راز نظیر پر غیر منکشف نہ تھا

خورشید، جس سے لعل کی ہوتی ہے تربیت
وہ اُن لبوں کے پان کا ادنیٰ اُگال ہے

خواہش میں اُلوہیت ہے، یعنی طلب اگر صادق ہے تو آرزو کا بر آنا یقینی ہے۔ لیکن ہر آرزو، آرزو نہیں ہو سکتی اور اس کے لئے کوئی پیمانہ و اندازہ ضروری تھا۔ نظیر نے یہ پیمانہ ایک شرط لگا کر پیش کیا ہے، شرط بھی کتنی جامع و مانع! اور ساتھ ہی ایک درس حیات بھی دیدیا ہے:۔

آرزو خوب ہے، موقعے سے اگر ہو، ورنہ
اپنے مقصود کو کم پہونچے ہیں بسیار طلب

انگریزی زبان میں ایک جملہ ضرب المثل کے طور پر اکثر بولا جاتا ہے جسکا مفہوم ہے کہ ساغر کے لبوں تک پہونچنے میں چھلک جانیکے بہت سے امکان ہیں۔ نظیر انگریزی تو یقیناً نہیں جانتے تھے، مگر اُنکی بصیرت اتنی تھی کہ یہ عندیہ اُن کے خیال کی رسائی سے بچ نہ سکا:۔

کیا کاسئہ مے لیجئے اس بزم میں اے ہمنشیں
دورِ فلک سے کیا خبر پہونچے گا لب تک یا نہیں

زندگی کی واقعیتیں زندگی اگر عالم رویا کی زندگی ہوتی تو نہایت خوب چیز تھی - مگر زندگی نام ہے بیدار لمحوں کا اور بیداری میں زیست کی تلخیاں اٹل اور سخت ہیں - ان تلخیوں کے گوارا ہو جانے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے اور وہ حکیمانہ نقطۂ نگاہ ہے - نظیر نے ان تلخ حقیقتوں کے راز اکثر کھولے ہیں - اگرچہ اس قسم کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ نظم کو بنایا ہے، مگر غزل کے اشعار میں بھی ایسے خیالات بیان کر جاتے ہیں :-

دیکھا جو خوب ہم نے، دنیا ہے جائے مطلب ہو کس طرح نہ ہم کو ہر دم ہوائے مطلب
اُس کو بھی دے چکے ہیں، اکثر برائے مطلب وہ آبرو کہ جس پر کرتے ہیں جاں تصدق
نہیں اور کسی سے کوئی روٹھا نہ منا ہے ملنا بھی غرض کا ہے لڑائی بھی غرض کی
اے دوست کون پھر کرے ماتم فقیر کا ہم کیوں نہ اپنے آپ کو رو لیویں جیتے جی،
بن آتی ہے تو ہوتی ہیں سب باتیں ٹھیک ٹھیک سچ ہے بقول حضرت سید نظیر، آہ،

خوشی کے فلسفہ کی یہ تعریف شاید ملٹن نے کی ہے کہ انسانی مسرت کا ماحصل سب کے لئے یکساں ہے میاں نظیر اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے :-

زیادہ اُن سے ہے ہر بے نوا کو عیش و طرب اگرچہ اہلِ نوا خوش ہیں ہر طرح، لیکن،
جو شاہ کو ہے، وہی ہے گدا کو عیش و طرب کمالِ قدرتِ حق ہے نظیر کیا کہئے

نظیر کا فلسفۂ زندگی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفسیر و تشریح اگرچہ نظیر کے کلام میں ملتی ہے، لیکن مجموعی طور سے اُنھوں نے بھی اُسے "نکشودہ معما" ہی مانا ہے - وہ ہر شے اور ہر حالت کو بڑی شدت سے گزشتنی مانتے ہیں - اسی لئے ہر حال میں خوش ہیں -

ہستیٔ انسان کی حقیقت یا خودی کا احساس نظیر کو کس طرح ہوتا ہے ؟ کہتے ہیں :-

کچھ نہیں ہم میں تو ہستی و عدم میں کچھ نہیں سب غلط ہے یہ جو کہتے ہیں کہ ہم میں کچھ نہیں

ہستیٔ انسان کی غایت اور مقصود کا اعتراف تو نظیر کرتے ہیں، لیکن انسان کس خاص کام کے لئے پیدا ہوا ہے اسکو ناگفتہ ہی چھوڑ دیتے ہیں :-

خانہ خراب! تجھ سے وہی کام رہ گیا جس کام کو جہان میں آیا تھا تو نظیر

ہستیٔ انسان اور زندگی کی کشمکش اور غفلتوں کو نظیر جس طرح سمجھے ہیں، وہ ذیل کی غزل میں ایک جگہ نظر آجاتا ہے اس غزل میں نظیر کا مصلحانہ رنگ بھی ہے جسے میں نے الگ نہیں دکھایا ہے :-

یہ جس کا ہے اُسی کا ہے، نہ تیرا ہے نہ میرا ہے جو تو کہتا ہے اے غافل "یہ میرا ہے یہ تیرا ہے"
نمازی ہے، شرابی ہے، اُچکا ہے، لٹیرا ہے تو اول سوچ تو دل میں کہ تو ہے کون اور کیا ہے

فرشتہ ہے، پری ہے، دیو ہے یا آدمی، جن ہے — بلا ہے، بھوت ہے، بامن، مزور ایا کمیرا ہے
تیری کیا ذات ہے، کیا نام ہے، کیا کام کرتا ہے — مسافر بے وطن ہے، یا ترا اس جا پہ ڈیرا ہے
جب ان چیزوں سے تو اپنے تئیں کچھ چیز ٹھیرائے — تو اُس کے بعد پھر کہیو کہ "یہ تیرا یہ میرا ہے"
یہ چیزیں تو غرض کیا ہیں، تو اپنا ہی نہیں مالک — تجھے او بے خبر ناداں یہ کس غفلت نے گھیرا ہے
تو کچے سوت کا دھاگا عبث بل پیچ کھاتا ہے — یہ سب وہم غلط ہے اور قصور فہم تیرا ہے
تو کیا جانے کہ تجھ کو کس نے کس چرخے مِس کاتا ہے — تو کیا جانے کہ تجھ کو کس اٹیرن میں اٹیرا ہے
تماشا ہے، مزا ہے، سیر ہے کیا کیا، اہا ہا ہا — مصور نے عجب کچھ رنگ قدرت کا بکھیرا ہے
ترقی میں تنزل ہے، تنزل میں ترقی ہے — اندھیرے میں اُجالا ہے، اُجالے میں اندھیرا ہے
طلسمات حقیقی ہے، یہ کچھ سمجھا نہیں جاتا — یہی چاند اور یہی سورج، یہی شام اور سویرا ہے
نظیر اللہ اللہ، اس جہاں میں دم غنیمت ہے — کہاں ہم اور کہاں پھر تم، کوئی دم کا بسیرا ہے

میر کا انداز

محمد حسین آزاد نے نظیر کے چند شعروں کو میر کے انداز کا لکھا ہے۔ اُس کے لکھنے کا پیرایہ یہ ہے کہ گویا یہ چیز نظیر کے لئے فخر و مباہات کا موجب ہے کہ وہ میر کے رنگ میں چند شعر لکھ سکے۔ مجھے آزاد کے اس خیال سے مطلق اتفاق نہیں۔ میر کے رنگ میں کامیاب ہو جانا نظیر کے مقصد شاعری کے لئے باعث ننگ تھا۔ نظیر کی شاعری کا مسلک میر کے راستے سے بالکل جدا اور نہایت وسیع ہے۔ نظیر زندگی کے مفسر ہیں اور میر محض محبت کے ماتم گسار۔ میر کی شاعری میں فلسفۂ حیات معدوم اور نظیر کے یہاں بس یہی ایک چیز سارے عالم پر محیط ہے۔ اسلئے میر و نظیر کا تقابل کوئی معنے نہیں رکھتا۔

لیکن جہاں تک جذبات محبت کے احساس و اظہار کا تعلق ہے، میر کے یہاں صحیح احساس اور کامل اظہار ہوا ہے۔ مگر نظیر نے ان احساسات کے اظہار میں ذرا سے تفلسف سے بھی کام لیا ہے۔ نظیر کے احساسات محبت کی صداقت کے اظہار کو اُن کے فلسفہ نے تھوڑا سا سنجیدہ بنا دیا ہے۔ جذبات محبت میں گداز کا ہونا لازمی ہے، اور اُسی کے دلنشین بیان نے میر کی انفرادیت قایم کی ہے۔ نظیر کے یہاں نیاز عاشقانہ ہے، لیکن میر کی سی فتادگی کم ہے، گو تغزلی احساس کے اظہار کا پرداز کچھ مماثل ہو جاتا ہے:-

آیا وہ جب تو ہم نہ رہے اپنے آپ میں — دیکھا اسی طرح سے اُسے ہم نے بارہا
یوں تو ادا و ناز سب آتے ہیں اُس کے یاد — ہنسنا پر ایک اُس کا نہیں دل سے بھولتا
ہوا جو ہم کو وہ کوچہ چمن سرشت نصیب — خدا نے ہم کو اُسی جا کیا بہشت نصیب
کوچے سے اُس کے آتا ہوں یوں ہو کے نا اُمید — نوکر شکستہ حال کو جیسے ملا جواب

اتنا تو نامہ بر سے نہ ہوتا میں شرمسار | اے کاش بھیجتا وہ برا یا بھلا جواب
آگے ہی دل اپنا تو یہ سودائی ہے کم بخت | اور تس پہ سنا یہ کہ بہار آئی ہے کم بخت
نہ جاؤں میں تو اُس کے پاس لیکن کیا کروں یارو | یکایک کچھ جگر میں آکے لگ جاتا ہے نشتر سا
دل سا درِ یتیم بکا، ایک نگہ کے مول، | کیا کہئے، خیر، یہ بھی خریدار کے نصیب
گئے تھے ملنے کو شاید جھڑک دیا اُسنے | میاں نظیر تو کچھ شرمسار آتے ہیں
اُلفت نے اُس کی اوج یہ ہم کو دکھا دیا | جو رفتہ رفتہ خاک میں آخر ملا دیا

مضامین کا توارد

نظیر کے یہاں ایسے مضامین اور خیالات پائے جاتے ہیں جو شعرائے ماقبل لکھ گئے تھے اور وہ بھی ہیں جو بعد کے شعرا نے لکھے ہیں۔ یہ انتخاب نہ توارادتاً تھا اور نہ ضروری لیکن دوران مطالعہ میں اگر ذہن نے کوئی ہم مضمون یا قریب المفہوم شعر پیش کر دیا تو نشان لگا دیا تھا۔ غالباً چند شعروں کا تقابل غیر دلچسپ نہ ہوگا:-

غالباً خاقانی کا شعر ہے:-

من بندۂ آں ینم کہ ساقی گوید | یک جام دگر بگیر و من نتوانم

نظیر کہتے ہیں:-

ساقی ہمیں پلائے یوں جام پے بہ پے | جو ہم نشہ میں کہہ اُٹھیں اکبار بس جی بس

حافظ کا مشہور شعر ہے:-

بلا زمان سلطان کہ رساند ایں دعا را | کہ بشکر بادشاہی توز درماں گدا را

نظیر کہتے ہیں:-

مجھے وہ پوچھے تو یہ اُس کا لطف ہے ورنہ | وہ بادشاہ ہے اُسے مجھ گدا سے کیا مطلب

مرزا مظہر جانجاناں کا شعر ہے:-

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو | یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے

نظیر کہتے ہیں:-

نہ ٹوکو دوستو اس کی بہار نام خدا | یہی اب ایک ہے یاں گلعذار نام خدا

سودا و نظیر ایک ہی وقت میں تھے۔ سودا کا یہ مشہور شعر فارسی کا چربہ ہے:-

کیفیت چشم اُس کی مجھے یاد ہے سودا | ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

نظیر کہتے ہیں:- خدا کے واسطے گلگو نہ میرے ہاتھ سے لو | مجھے بو آتی ہے اس میں کسی بدن کی سی

نظیر کا شعر ہے:۔

جہاں بھی خواب ہے اور ہم بھی خواب ہیں لے دل
عجب بہار کا دیکھا ہے ہم نے خواب میں خواب

غالب کہتے ہیں:۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں، ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

نظیر کا شعر ہے:۔

تھے کل یہ خط عارضِ خوبانِ سبزہ رنگ
کہتی ہے آج خلق جنھیں سبزہ زار ہا

غالب کہتے ہیں:۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

نظیر کا شعر ہے:۔

ان سنگدل بتوں کا گلہ کیا کروں نظیرؔ
میں آپ اپنے شیشۂ دل کی شکست ہوں

غالب کہتے ہیں:۔

سن اے غارتگر جنس وفا سن
شکستِ شیشۂ دل کی صدا کیا

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

نظیر کا شعر ہے:۔

مر کر بھی تہ خاک نہ آسودہ ہوئے آہ
اے عشق نہ تھے ہم ترے انجام سے واقف

ذوق کہتے ہیں:۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

نظیر کا شعر ہے:۔

ابھی کہوں تو کسی کو نہ اعتبار آوے
کہ ہم کو راہ میں ایک آشنا نے لوٹ لیا

شیفتہ کہتے ہیں:۔

ابھی کہوں تو کریں لوگ شرمسار مجھے
کہ کس کے وعدے پہ اتنا ہے اعتبار مجھے

نظیر کا شعر ہے:۔

یوں جھمکتا ہے رخ اُس محبوب کا زیر نقاب
ہو نمایاں جس طرح ابر تنک میں آفتاب

غالباً جلیل نے کہا ہے:۔

رنگت یہ رخ کی اور یہ عالم شباب کا
آنچل میں تم تو پھول لئے ہو گلاب کا

نظیر کا شعر ہے :-

نا برق نہ خورشید نہ شعلہ نہ بھبوکا
کیوں صاحبو یہ حسن ہے یا اور ہی کچھ ہے

جلیل کہتے ہیں :-

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں،
وہ آدمی ہے وے دیکھنے کی تاب نہیں

نظیر کا شعر ہے :-

چمک جا پھر خدا کے واسطے اے طور کے شعلے
کہ مثل آتش افسردہ ہے دل پھر کچھ چلا کمہلا

جگر کہتے ہیں :-

ہنسی پھر اڑنے لگی عشق کے فسانے کی
نقاب اٹھاؤ، بدل دو ہوا زمانے کی

عام انتخاب

گردوں نے ہمکو کیا نہ دیا اور کیا دیا
سب کچھ دیا اگر دل بے مدعا دیا

خواب عدم میں ہم تو فراغت سے اے نظیر
سوتے تھے عشق نے مگر آکر جگا دیا

یہ کچھ بہروپ بن دیکھیو کہ بن کر شکل دانے کی
بکھرنا، سبز ہونا، لہلہانا، پھر سمٹ جانا

یہ یکتائی، یہ یکرنگی، تس اوپر یہ قیامت ہے
نہ کم ہونا نہ بڑھنا، اور ہزاروں گھٹ میں بٹ جانا

جو ہم میں شوخیاں تھیں جوانی میں اب کہاں
اُن بے وقوفیوں کا اک الزام رہ گیا

شراب و گلبدن ساقی، مزے عیش و طرب ہر دم
بہار زندگی کہئے تو ہے موسم جوانی کا

یہ بوڑھے گو کہ اپنے منہ سے شیخی میں نہیں کہتے
بھرا ہے آہ، پر ان سب کے دل میں غم جوانی کا

یہ پیرانِ جہاں اس واسطے روتے ہیں اب ہر دم
کہ کیا کیا ان کا ہنگامہ ہوا برہم جوانی کا

نہیں بوڑھوں کی داڑھی پر میاں یہ رنگ وسمے کا
کیا ہے آکے ایک ایک بال نے ماتم جوانی کا

اُٹھا کے سینہ، جھٹک بازو اور بنا کج دھج
چلے ہے جس گھڑی ٹھوکر کو مار نام خدا

قدم قدم پہ برہمن پڑھیں ہیں بسم اللہ
صنم بھی کہتے ہیں سب بار بار نام خدا

نشہ کی اب تلک آنکھوں میں کچھ نہ تھی مستی
پر اب کچھ آتا چلا ہے خمار نام خدا

دیکھنا ہمدم یہ اترا شبستاں میں قمر
یا تہِ کاکل کسی کے چہرے سے بالا پڑا

وہ بالا سا قد اُس کا اور وہ بالا کان کا یارو — کریں ہیں اُس پری کے بالے جوبن کو دو بالا سا

طرح دینا، اُڑا دینا، لگا دینا، بجھا دینا — یہ ڈھب ہیں یاد، تس پر یہ کچھ فریب اور فن نہیں آتا

چمنِ حسن میں اے نوگلِ بستانِ جمال — تو وہ گل ہے کہ بصد حسن جہانگیر کھلا
محو تدبیر ہیں ہم لیک خدا ہی جانے — کون سا گل ہے پس پردۂ تقدیر کھلا

وصف اُس کے حسن کا کس سے ہوا کلی مگر — جس کے جتنا فہم میں آیا، کہا، اچھا کہا

جدھر کو دیکھے اُدھر آپ ہی جھمکتا ہے — مزا پڑے نہ اُسے کیوں کہ شیش محلوں کا
کہا میں یار سے ایک دن کہ دل یہ چاہے ہے — طریق جیسے ہے عشرت کے اہلے گہلوں کا

ایک نظر گر تجھے دیکھ لیں، شادی سے پھر — مہ کو لگیں چار چاند، مہر کو چار آفتاب

کیسا ہی وہ برا ہو تو لگ جائے جس سے دل — لگتا ہے دل کو پھر وہی واللہ سب سے خوب

عشق میں اُس گوہر نایاب کے — آج تلک خشک ہیں دریا کے لب

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب — اہل صورت کا ہے دریا اہل معنی کا سراب

اے مری جان ہمیشہ ہو تری جان کی خیر — نازکی دور بلا، حسن کے سامان کی خیر

سو چمن ایک نقطہ اُسکے ہیں مکھڑے میں نظیر — جب یہ صورت ہو تو پھر کس کو خدایا د رہے

ایام شباب اپنے بھی کیا عیش اثر تھے — کہتے ہیں جنھیں عیب وہ اُسوقت ہنر تھے

دل پیر بھی ہو جائے پر اُس کا نہ اثر جائے ہے حسن پرستی بھی عجب چیز وفا کیش،

استنے میں ساقی نے دی اُس سے کڑی اور بھی پہلے ہی ساغر میں تھے ہم تو پڑے لوٹتے

خاتمۂ کلام المختصر یورپ کی ترقی تمدن و علوم نے شعر و ادب کا جو معیار مقرر کیا ہے اور تنقید کا جو پیمانہ قایم کیا ہے، نظیر نہ صرف اُس معیار کے شاعر ہیں اور اُس پیمانے پر پورے اُترتے ہیں، بلکہ عہد حاضر میں ادب کے متعلق جو نظریات جاری و ساری ہیں وہ بھی نظیر کے کلام سے مستنبط ہوتے ہیں

مجھے احساس ہے کہ نظیر کے غزلیہ کلام سے جو اشعار مثالاً پیش کئے گئے ہیں، اُن کی تعداد بڑھ گئی ہے اور عجب نہیں کہ بعض طبیعتوں پر گراں بھی ہو، لیکن معذرت کی درخواست کے ساتھ ساتھ یہ عرض ہے کہ ایسا بالقصد کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ کلام چھپا نہیں ہے، اس لئے جتنا زیادہ حصہ لوگوں کے سامنے آسکے نظیر کے متعلق بہتر رائے قایم کرنے میں مدد دے گا۔

لطیف الدین احمد اکبرآبادی (ہندستانی)

پبلک سروس کمیشن - یو۔پی

ترمیم

کمیشن کے پچھلے اشتہار مورخہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں (جس میں ویدوں اور اطبا کی جگہوں کے لئے درخواستیں طلب کی گئی ہیں) حسب ذیل ترمیم کی جاتی ہے۔

(۱) امیدوار کے لئے لازم ہے کہ وہ (الف) یا تو آیورویدک کالج بنارس ہندو یونیورسٹی یا طبیہ کالج علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کا سند یافتہ ہو۔ (ب) یا بورڈ آف انڈین میڈیسن صوبجات متحدہ کا رجسٹرڈ وید یا طبیب ہو۔

ان امیدواروں کو جو کہ آیورویدک کالج یا طبیہ کالج مذکورہ بالا کے سند یافتہ ہوں گے ترجیح دیجائے گی۔

(۲) امیدوار کی عمر یکم دسمبر ۱۹۳۸ء کو بتیس سال سے کم اور پینتالیس سال سے زیادہ نہ ہونا چاہئے۔

(۳) درخواستیں بجائے ۵ دسمبر ۱۹۳۸ء کے ۱۵ دسمبر ۱۹۳۸ء تک سکریٹری صاحب پبلک سروس کمیشن یو۔پی الہ آباد کے پاس پہونچنا چاہئیں۔

مصدورہ الہ آباد
مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۳۸ء

کتابوں کی یونیورسٹی

چند سال ہوئے میں آل انڈیا لائبریری کانفرنس کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے جس کا اجلاس لاہور میں ہونے والا تھا علامہ سر محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ وہ مجلس استقبالیہ کی صدارت قبول فرمائیں علامہ موصوف نے میری استدعا کو نہایت خندہ پیشانی سے سُنا لیکن آپ نے نہایت شائستگی مگر صاف گوئی کے ساتھ فرمایا کہ وہ میری درخواست کو منظور نہیں کر سکتے ہیں انتہائی مایوسی کے عالم میں وہاں سے رخصت ہونے ہی والا تھا کہ انھوں نے مجھ سے دریافت کیا "کیا کتب خانے کوئی کام کی چیز ہیں اور کیا کتابوں کے مطالعہ سے کچھ فایدہ حاصل ہوتا ہے"۔ ان کے اس سوال کا میں اسوقت کوئی جواب نہ دے سکا اور عرصہ تک میرے دماغ میں یہ سوال گونجتا رہا۔ میں حیران تھا کہ اقبال ایسے فاضل انسان کو کتابوں کے مطالعہ سے اسدرجہ نفرت و گریز کیوں ہے۔ کم ازکم علامہ کے سوال سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا اور اس کے کوئی اور معنی نہ سمجھ سکا۔ مجھے امید نہ تھی کہ صاحب موصوف نے میرے ساتھ وہی طرزِ عمل اختیار کیا ہوگا جو ایک ممتحن زبانی امتحان میں کسی طالب علم کے ساتھ اختیار کرتا ہے، ممدوح کا یہ مقصد کبھی نہ رہا ہوگا کہ وہ میری معلومات کا امتحان لیں یا میری قوت تشریح و ترغیب کو پرکھیں، یقیناً سوال میں اس سے کچھ زیادہ گہرائی تھی، اس میں کتابوں اور ان کے مطالعہ کے متعلق اس بے اعتمادی کا اظہار تھا جس کے متعلق اور مفکرین بھی روشنی ڈال چکے ہیں۔

اس سوال پر غور و فکر کے اثنا میں میرے سامنے اور بھی ایسے ارباب فکر آئے جو اس اصول کے قطعاً منکر تھے کہ کتابوں کے مطالعہ سے عقل و دانائی پیدا ہوتی ہے مجھے اسٹیونسن کے "کاہل" کا خیال آیا۔ اس نے اپنے دلچسپ مقالہ "کاہلوں کے لئے ایک اعتذار" میں کتابوں کے مطالعہ کے خلاف ایک زبردست احتجاج کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے اپنے زمانہ میں بہت کافی لکچر سنے ہیں مجھے ابھی تک یاد ہے کہ لٹو کا گھومنا حرکت کی سکون کی ایک صورت ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ حق شفع کوئی مرض نہیں ہے اور نہ طلب حق آسایش کوئی جرم ہے لیکن اگرچہ میں اپنی معلومات علمی کے ان جواہر پاروں سے بخوشی محروم ہونا نہ پسند کروں گا تاہم میں ایک لمحہ کے لئے بھی تیار نہیں ہوں کہ ان معلومات کو وہی اہمیت دوں اور ان کی وہی قدر و قیمت سمجھوں جو میں نے اسکول سے

غائب ہو کر آوارہ گردی میں حاصل کی ہے" اس سے وہ یہ استدلال کرتا ہے کہ کتابوں کا بہت زیادہ مطالعہ فضول ہے، اس کی قدر و قیمت ایک شمعدان کی سی بھی نہیں ہے کیونکہ یہ ہماری زندگی پر (جس طرح ہم اس کو بسر کرنا چاہتے ہیں) بہت کم اثر انداز ہوتی ہے، مزید براں اس کا اعتقاد ہے کہ کتابیں ہم کو زندگی کے اُن کمل و صحیح تعلقات سے بیگانہ بنا دیتی ہیں، جو فی الحقیقت بہت کار آمد ہیں۔ ایک کتابی آدمی " لیڈی آف شیلاٹ " کی طرح ہے جو زندگی کو اپنے اصلی خد و خال میں بمشکل دیکھ سکتی تھی، بلکہ وہ صرف ان پرچھائیوں پر قانع تھی جو آئینہ میں اسے نظر آتی تھیں ایسا شخص جو مسلسل کتابوں کے مطالعہ میں لگا رہتا ہے، تجربہ اور مشاہدات کا لطف صرف ثانوی حیثیت سے حاصل کرتا ہے، وہ حقایق کی دنیا سے الگ، صرف بھوتوں، پرچھائیوں اور دھندلی شکلوں کی دنیا میں رہتا ہے، وہ ان چیزوں کا مطالعہ کرتا ہے جو دوسروں نے انجام دئے ہیں جنھیں اوروں نے سوچا اور کیا ہے اور اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیتا ہے کہ اسے خود بھی غور و فکر کی حساس زندگی بسر کرنا ہے۔ آگے چلکر وہ کہتا ہے کہ کتابوں کا مطالعہ انسان کو اس عجیب و غریب دنیا سے الگ کر دیتا ہے جس کے محاسن و معائب کا مطالعہ وہ خود اپنی آنکھوں سے کر سکتا ہے۔ کتابوں کا عاشق بالکل تن آسان اور بے حس زندگی کا عادی ہو جاتا ہے وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتا کہ فراہمی معلومات کے لئے اپنے حواس ہی کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے آکسفورڈ کے پر فضا میدانوں کا وجود صرف میتھو آرنلڈ اور رابرٹ برجز کی نظموں میں پایا جاتا ہے اور بلبل کے نغمے صرف حافظ کی مترنم غزلوں میں وہ صرف ان پھولوں کی خوشبو سونگھتا ہے جن کو کیٹس نے اپنی بہاریہ نظم میں پیش کیا ہے اور اس کو کسی صحبت کی مسرتوں کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اسکا ذکر کسی تذکرہ یا سیاحت میں پڑھتا ہے، الغرض دنیا کی بہترین چیزوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت اس سے مفقود ہو جاتی ہے اور کائنات کے گوناگوں مناظر و مظاہر اس کے لئے بالکل ناممکن الفہم۔

کتابیں صرف ہماری قوت مشاہدہ ہی کو معطل کر دیتی ہیں بلکہ وہ اکثر ہماری آنکھوں کو زندگی کے عملی پہلو کی طرف سے بند کر دیتی ہیں اور نپٹ مکتبی اور ملا بنا دیتی ہیں، تو روں نے نہایت واضح اور مدلل طور پر اپنی کتاب والڈن میں اس موضوع پر بحث کی ہے۔ یہ امریکی مصنف جو عہد جدید کی میکانکی اور مذموم تہذیب سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں رکھتا تھا، صرف اصول فطرت تبلیغ کرتا تھا اس نے اپنے وطن کو جو عہد حاضر کے جملہ اسباب عیش و نشاط سے آراستہ تھا، خیرباد کہکر ایک تالاب کے قریب رہنا اختیار کیا، اور یہاں جدید طرز زندگی کے شور و غوغا سے علحدہ ہو کر اس نے جدید تہذیب کی اساس و بنیاد پر غور کرنا شروع کیا اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ سب مکر و فریب ہے۔
اُس نے ان تمام اداروں کا تجزیہ شروع کیا جن کو آج کل کا مہذب انسان اجتماعی روشن خیالی کے ادارے ظاہر کرتا ہے اور اس نے محسوس کیا کہ یہ سب بے حقیقت ہیں۔ اس نے امریکہ کے رائج الوقت نظام تعلیم کو جس میں

کتابوں کے ذریعہ سے علم سکھانے پر زور دیا جاتا ہے، بالکل ناقص قرار دیا۔ یہ کتابی تعلیم زندگی کے حقایق سے قطعاً محروم کر دیتی ہے اور اس لئے بالکل بے معنی ہے۔ اس نے ایک خطیبانہ انداز سے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے "نوجوان کیونکر بہتر زندگی بسر کرتے ہیں؟ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ ابتدا ہی سے ذاتی تجربات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اگر میں یہ چاہوں گا کہ کوئی لڑکا فنون و علوم سے واقفیت حاصل کرے تو میں رائج الوقت روش کبھی اختیار نہیں کروں گا جس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ایک بچے کو کسی پروفیسر کے پڑوس میں رکھا جائے جہاں زندگی گزارنے کے فن کے سوا اور تمام باتیں بتلائی اور سکھلائی جاتی ہیں اور جہاں دنیا کا صرف سطحی مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ جہاں علم الکیمیا سکھلایا جاتا ہے لیکن یہ نہیں بتلایا جاتا کہ اس کی روٹی جو وہ روز مرہ کھاتا ہے کس طرح بنتی ہے، یا جہاں میکانیک کی تعلیم دیجاتی ہے لیکن نہیں سکھایا جاتا کہ معاش کس طرح حاصل کی جاتی ہے یا جہاں نیچون سیارہ کے نئے چاندوں کا دریافت کرنا سکھایا جاتا ہے لیکن یہ نہیں بتلایا جاتا کہ وہ خود اپنی آنکھ کے تنکے کا کس طرح پتہ لگائے۔ آپ کے سامنے دو بچے ہیں، ایک وہ جس نے اپنا جیبی چاقو اس دھات کے ٹکڑے سے بنایا ہو جسے اس نے خود کھود کر نکالا تھا اور گلا کر صاف کیا تھا لیکن پڑھا صرف اتنا ہی تھا جتنا کہ اس کام کے انجام دینے کے لئے ضروری تھا اور دوسرا لڑکا وہ ہے جس نے معدنیات پر بہت سے لکچر سنے ہوں اور اپنے شفیق باپ سے ایک چاقو بطور انعام پایا ہو۔ پھر آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ ان دونوں لڑکوں میں سے کون زیادہ کارآمد ہے۔ میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے اپنے کالج کے ایام کے اختتام پر بتلایا گیا کہ مجھے فن جہاز رانی سکھلایا گیا ہے درانحالیکہ اگر میں نے کسی جہاز کے اندر کام کر کے بندرگاہ کے گرد ایک چکر بھی لگا لیا ہوتا تو مجھے اس سے کہیں زیادہ معلومات حاصل ہو جاتیں، ایک طالب علم کو معاشیات و اقتصادیات کی تعلیم تو دیجاتی ہے لیکن زندگی کیونکر کفایت شعاری کے ساتھ بسر کی جاتی ہے اسکی تعلیم نہیں دیجاتی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے والدین کو ناقابل ادا قرض کی مصیبت میں گرفتار کر جاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ کتابوں کے مطالعہ کے خلاف اس سے زیادہ پرزور احتجاج شاید ہی کسی نے کیا ہو تورو کے قول کے مطابق کتابیں فی الحقیقت خود اپنے ہی مقاصد کو شکست دے دیتی ہے کیونکہ یہ ہم کو حقایق کی دنیا سے نکال کر محض خیالی شکلوں اور غیر حقیقی صورتوں کے عالم میں گم کر دیتی ہیں۔

کتابوں کا مطالعہ دوسرے قسم کے خطرات میں بھی مبتلا کر دیتا ہے، ولیم ہیزلٹ نے اپنے ایک نہایت مشہور مقالہ موسومہ "علما کی جہالت" میں ان خطرات کو واضح طور پر بیان کیا ہے لکھتا ہے کہ:۔

"غیر معمولی تبحر علمی ایک ایسا خطرہ ہے جس میں بہت سے علماء گرفتار ہیں۔ ان کی نظر کوتاہ ہوتی ہے اور فکر دور رس نہیں ہوتی ان کی دلچسپیوں کا حلقہ بہت محدود ہو جاتا ہے اور ان کی حالت اتنی ہی قابل رحم ہوتی ہے جتنا

کسی کارخانہ کے اس کاریگر کی جس کو صرف آلپنوں کے سروں کے بنانے کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اول تو پنوں کا بنانا ہی خود کوئی عقل کو بڑھانے والا کام نہیں ہے اس پر طرہ یہ کہ اس کو چھوٹے سے کام میں سے بھی بہت چھوٹا سا حصہ انجام دینا پڑتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کاریگر اپنی ساری زندگی اپنے کام میں صرف کر دیتا ہے جو ذہنی سکون پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ نام نہاد علماء صرف الفاظ کے غلام بن جاتے ہیں اور قدرت کے مشاہدہ کے لئے ان کے پاس بینائی باقی نہیں رہتی وہ اشیاء کا ادراک دوسرے اشیاء کے ذریعہ سے کرتے ہیں انکی کتابیں انکے اور اشیاء کائنات کے درمیان حجاب بن جاتی ہیں۔ کتابی کیڑا ایک قسم کی تن آسانی اور بے حس زندگی کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ ایک گراموفون ہے جو صرف دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کو چالاکی سے دہراتا رہتا ہے۔ ایسے لوگ دوسروں کی آنکھوں سے دیکھنے ان کے کانوں سے سننے اور ان کے اعتقادات پر اپنے عقاید کی بنیاد رکھنے کے شایق ہوتے ہیں۔ انھیں ناموں اور تاریخوں کا علم ضرور حاصل ہوتا ہے لیکن انسان اور اشیاء عالم کا علم بالکل نہیں ہوتا وہ ہنڈوں اور قلماقی تاتاریوں کے ذات پات کا مطالعہ تو نہایت شغف کے ساتھ کرتا ہے، لیکن اپنے ہمسایہ کے حالات سے بے خبر ہوتا ہے۔ وہ قسطنطنیہ اور پیکین کے طول و عرض سے بخوبی واقف ہے، لیکن اپنے پڑوس کی گلیوں کی اسے خبر نہیں ہوتی وہ خود اپنے احباب کے حالات سے آگاہ نہیں ہوتا لیکن تاریخ کے مخصوص افراد پر بہت پر زور لکچر دے سکتا ہے"

کتب بینی کے خطرات کا ذکر صرف مقالہ نگاروں ہی نے نہیں کیا ہے بلکہ بعض افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں نے بھی اس پر روشنی ڈالی ہے، چیخوف نے اپنے افسانہ "معلم الادبیات" میں ایک معلم کی کردار نگاری کی ہے، یہ بیچارہ جغرافیہ کا معلم تھا اس کو اپنے مخصوص مضمون میں اسدرجہ انہماک تھا کہ اور تمام چیزوں سے دلچسپی ختم ہو گئی تھی اسکا ایک رفیق عشق میں مبتلا ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے دوست کو داستان دل سنائے لیکن اسے ہمت نہیں ہوتی۔ اس معلم نے کائنات کو صرف دو چیزوں میں محدود کر دیا تھا تاریخ اور نقشے۔ زندگی کے معاملات میں اسکی حیثیت ایک احمق سے زیادہ نہ تھی، وہ بالعموم خاموش رہتا اور جب کبھی گفتگو کرتا بھی تو نہایت خشک اور عامیانہ۔

اناطول فرانس نے بھی ان علما کا دبی زبان سے مضحکہ اڑایا ہے اور ان لوگوں پر طنز کیا ہے جو بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھتے ہیں۔ اس نے اس سلسلہ میں ایک کہانی بیان کی ہے کہ ایک شاہزادہ عجم کے تخت پر متمکن ہوا تو اس نے تمام علماء کو بلایا اور ان سے فرمایش کی کہ وہ بہت جلد ایک ایسی تاریخ عالم مرتب کر دیں جو سلطنت کے انتظام میں اسکے لئے مفید ہو۔ علماء اور عقلا بیس سال گزرنے پر بارہ اونٹوں کے قافلہ کے ساتھ دربار میں پہونچے، وزیر نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ علماء سلطنت تاریخ کی چھ ہزار جلدیں مرتب کر کے لائے ہیں اور اس عظیم الشان تاریخ کا صرف دیباچہ پانچسو جلدوں پر مشتمل ہے، بادشاہ نے وزیر سے کہا یہ تصنیفات حکومت کے محافظ خانے میں محفوظ رکھدی جائیں اور علماء سے

کہا جائے کہ وہ اتنی مختصر کتاب لکھیں کہ اس تھوڑے سے وقت میں جو میرے پاس ہے میں اس کو پڑھ سکوں۔ علماء بیس سال کے بعد پھر آئے اور اس مرتبہ وہ صرف ۱۵۰۰ جلدیں لائے۔ بادشاہ نے کہا میرے پاس ان کے پڑھنے کا بھی وقت نہیں ہے کیونکہ اب میں ضعیف ہو چکا ہوں، انھیں اور مختصر کیا جائے، علماء دس سال بعد پھر واپس آئے اور پانچسو جلدیں اپنے ہمراہ لائے لیکن بادشاہ نے پھر وہی جواب دیا کہ اس کے پاس پانچسو جلدیں پڑھنے کا بھی وقت نہیں ہے علماء پھر واپس چلے گئے اور پانچ سال کے بعد ایک جلد لیکر آئے لیکن اسوقت بادشاہ بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اس افسانہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابیں لکھنے کا کام کسقدر تضیع اوقات ہے اور ان کا مطالعہ بھی کس قدر دشوار ہے ایک آدمی بغیر زیادہ پڑھے ہوئے بھی حقیقی وضروری عقل حاصل کر سکتا ہے۔

ابھی تک تو میں گویا شیطان کی نیابت کر رہا تھا اور کتاب بینی کے خطروں کی تفصیل پیش کر رہا تھا اور ایسا کرنا ضروری بھی تھا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ کتب بینوں کو ان گڑھوں اور گھاٹیوں سے آگاہ کر دوں جو مطالعۂ کتب کے دوران میں سامنے آتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیا بڑی حد تک کتابوں کی رہین منت ہے اور بہت سے لوگوں کی زندگی اس سے سدھر گئی ہے۔

اسٹیونسن کو افسانہ میں رشد و ہدایت کا سرچشمہ نظر آتا ہے اور اسی لئے وہ (Three Musketeers اور Pilgrims Progress) کا بڑا مداح ہے۔ اس نے شکسپیر کے ڈراموں سے بھی کافی فایدہ اُٹھایا۔ گیٹے کی سوانح میں اسے روحانی غذا ملی۔

ارباب عمل نے بھی کتابوں کے مطالعہ کو بہت مفید بتایا ہے، لارڈ گرے کا عقیدہ تھا کہ کتب بینی بہترین تفریح ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "جب میں معتمد اُمور خارجہ تھا تو سخت تھکا دینے والے کام کے بعد تفریح کی سب سے بہتر صورت میں نے یہ نکالی تھی کہ اپنے تصیاتی کتب خانہ میں پہونچ جاتا۔ ارل آف بالڈون نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ کلاسیکی ادب کا بہت منت پذیر ہے اس کے خیال میں ہوریس، ہومر، اور ورجیل کا مطالعہ اخلاقی حیثیت سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے۔

بعض اوقات کتابوں نے لوگوں کو نیا عزم و استقلال بخشدیا ہے اور زندگی کے دھارے کا رخ بدلدیا ہے جان اسٹورٹ مل نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھا ہے کہ ایک بار میں زندگی میں سخت مایوس ہو گیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز باطل ہے۔ اتفاق سے مجھے ورڈس ورتھ کی نظموں کا ایک نسخہ ہاتھ آگیا میں نے اسے بغور پڑھا تو خوشی محسوس کرنے کی صلاحیت پھر عود کر آئی اور ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کا ولولہ میرے اندر پیدا ہو گیا۔

جس طرح ورڈس ورتھ کی نظموں نے مل کو ایک نئی شاہراہ زندگی پر لگا دیا اسی طرح رسکن اور ٹالسٹائے کی چند کتابوں نے مہاتما گاندھی کی زندگی کا رنگ ہی بالکل بدلدیا وہ کہتے ہیں کہ "ٹالسٹائے کی کتاب" ایشور کا راج

خود تمہارے اندر ہے'' نے مجھے مبہوت و مسحور بنا دیا اور اس کی آزاد خیالی، عمیق مذہبیت اور صداقت کے سامنے تمام دوسری کتابیں پھیکی نظر آنے لگیں۔''

مسولینی کو کبھی یہ حیثیت نہ حاصل ہوتی اگر کارل اور نیٹشے کا مطالعہ اس نے نہ کیا ہوتا، لینن کو سماج کی تعمیر جدید کا شوق کارل مارکس کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔ الغرض مطالعۂ کتب کے فائدہ سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن یہ حقیقت ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ اپنی تعلیم آپ، ہر اس تعلیم سے بہتر ہے جو دنیا کی کسی یونیورسٹی میں دیجاتی ہے۔ اس سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ جو تعلیم اسکولوں یا یونیورسٹیوں میں دیجاتی ہے وہ لغو ہے بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اپنا پسند کیا ہوا طریقہ تعلیم بدرجہا بہتر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی تعلیم کے لئے نصاب کیا ہونا چاہئے۔ میں اس سلسلہ میں کتابوں کے نام نہیں گنواؤں گا بلکہ اصولاً صرف یہ ظاہر کردوں گا کہ اگر انسان کو صحیح معنی میں انسانی زندگی بسر کرنا ہے تو اسکو دنیا کی مختلف قوتوں کے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے، اس کے لئے تھوڑی سی تاریخ پڑھنا ضروری ہے مگر صرف اپنے ہی ملک کی نہیں بلکہ سارے عالم کی۔ اسی کے ساتھ ان جلیل القدر لوگوں کے سوانح حیات پڑھنا چاہئے جنھوں نے دنیا میں ذہنی انقلابات پیدا کئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ تاریخی ناول بھی پڑھنا چاہئے جو ماضی کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر دینے والے ہیں اور فلسفہ کے مطالعہ کی بھی کوشش کرنا چاہئے خاصکر نفسیات اور اخلاقیات کا مطالعہ کہ یہ سائنس کے مطالعہ کا بھی ذوق پیدا کریگا ساتھ ہی ساتھ عمرانیات اجتماعیات اور سیاسیات کا مطالعہ بھی کرنا چاہئے۔ اس طرز کے مطالعہ کے لئے کتابیں گنانا بے سود ہے پڑھنے والے کو خود اپنے مقاصد کا صحیح اندازہ کرنا چاہئے کہ نقادوں نے کتابوں کی تین قسمیں کی ہیں، معلوماتی کتابیں، تفریحی کتابیں اور الہام بخش کتابیں اور ان سب کا مطالعہ ضروری ہے۔

پروفیسر دیوان چند شرما — سید محمد عبد العلیم ہاشمی

نگار کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کریں قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:۔

(سنہ ۲۶ء) جنوری ۵ر۔ (سنہ ۲۷ء) اپریل ۴ر۔ (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ۔
(سنہ ۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر فی پرچہ۔
(سنہ ۳۴ء) فروری و اکتوبر ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۵ء) فروری، اپریل تا اگست، اکتوبر تا دسمبر ۵ر فی پرچہ۔
(سنہ ۳۶ء) فروری، مارچ، اپریل، مئی، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۵ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۷ء) مارچ اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، نومبر ۸ر فی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

مخلص نواز، آپ نے غالب کا یہ شعر سنا ہوگا :-

من آں نیم کہ دگر می تواں فریفت مرا
فریبمش کہ مگر می تواں فریفت مرا

مدعا یہ کہ آپ نے میری سادگی کا یقین کیوں کرلیا۔ مانا کہ راوی کوئی اور نہ تھا خود میں ہی تھا، لیکن یہ تو دیکھئے کہ روایت کس سے بیان کی گئی تھی۔ اُس سے کہ جس نے آج تک سچی بات کا کبھی یقین ہی نہیں کیا۔ پھر یہ سب کچھ جانتے ہوئے آپ کا یہ سمجھ لینا کہ میرا شمار بھی اُن لوگوں میں ہے

جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

کہاں تک درست ہو سکتا ہے

میرے نزدیک ہر وہ بات جسے ضمیر انسانی گوارا کر سکے، صداقت سے باہر نہیں ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ میری صداقت آپ کا کذب ہو اور میرا کذب آپ کی صداقت۔ اس باب میں فلسفہ و منطق سے کام لیکر کوئی خاص نظریہ پیش کرنا لایعنی سی بات ہے۔ رہا سوسائٹی کا سوال، سو آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں جتنے "اجتماعی" جھوٹ بولے گئے ہیں، اتنے انفرادی جھوٹ نہیں بولے گئے

مذاہب عالم کے نظریوں کو دیکھئے، تاریخی "حقایق" کی چھان بین کیجئے، اس کی مثالیں بکثرت مل جائیں گی

میں آپ سے زیادہ عقلمند ہونے کا مدعی نہیں ہوں، لیکن اتنا احمق بھی نہیں کہ آپ کی "فکرِ بیدار" کی داد نہ دے سکوں۔ آپ نے جو کچھ کیا، اسے آپ کا جی خوش کرنے کے لئے کہئے تو "خوب" کہدوں، ورنہ سچ پوچھئے تو میں آپ کی ذہانت و فراست سے بہت فروتر سمجھتا ہوں

اللہ، اللہ، یہ زہرہ گدازیاں! یہ حوصلہ فرسائیاں! — میں تو عتاب نامہ دیکھ کر کانپ اُٹھا کہیں یہ نزلہ اس عضوِ ضعیف پر تو گرنے والا نہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میرے ساتھ قدرت کا معاملہ اسوقت تک کیا رہا ہے

ہرچہ از گریہ فشاندیم بہ نشمردن ریخت
ہرچہ از نالہ رساندیم بہ نشنودن رفت

کلیجہ پتھر کا ہوگیا ہے اب نہ "غمزۂ ناہید" کا اثر ہوتا ہے نہ "قہرِ مریخ"، کا۔ آنکھ، زبان خشک ہیں اور دل برف کی قاش۔ پھر آپ کہ ابھی تک "خیالِ طرۂ لیلیٰ" لئے بیٹھے ہیں، اس شخص کا قدم کیوں درمیان لاتے ہیں جو ماوراء دنیائے "محمل و منزل" زندگی بسر کر رہا ہے۔

آپ کے اس زعم و پندار کا جواب میرے پاس صرف یہ ہے کہ:۔

"غبارِ سطرِ آشفتگی بر ہوا نگاشت، پنداشت مصنفِ کتاب آسمانم،
پر کاہے، بنیادِ فطرت بر باد گزاشت، دانست منشیِ طومارِ کہکشانم"

لاحول ولاقوۃ، آپ بھی عجیب چیز ہیں۔ میں کہ

بر سرم ز آزادی سایہ را گرانیہاست

ان کو اپنے پاس رکھ کر ساری دنیا کی ذمہ داریاں اپنے سر لیلوں! میری حماقت پر آپ کو اتنا زبردست اعتماد ہے یہ خبر مجھے نہ تھی!

مردانگی کا راز صرف رازدارانہ زندگی بسر کرجانا ہے۔ یعنی باوجود احساس و تاثر کے دوسروں کے سامنے بیخبرانہ رہنا۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب دُنیا کے ساتھ کم سے کم امیدیں وابستہ ہوں، مایوسی کے مقابلہ کے لئے زیادہ سے زیادہ تاب مقاومت پیدا کی جائے

مرد وہ ہے جو گھر میں فاقہ کرتا ہے لیکن باہر نکلتا ہے تو اس کی مونچھوں پر بل ہوتا ہے اور پیشانی پر جلال۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جب سوال صرف اپنی ذات کا ہو۔ دوسروں کی ذمہ داریاں اپنے سر آئیں اور زمانہ نے نیچا دکھایا

دوسروں کے لئے تکلیف اُٹھانا اس میں شک نہیں بڑی چیز ہے، لیکن انسانی وقار کو کھو کر یہ چیز حاصل کرنا کم از کم میرے بس کی بات نہیں

آپ خفا تو ہوں گے، لیکن آج آپ کی برہمی برداشت کرلینا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ کل آپ بھی مجھے

ذلیل سمجھنے لگیں- اس صورت کے علاوہ اور جو تدبیر آپ تجویز فرمائیں اس میں بقدر امکان حصہ لینے کے لئے طیار ہوں

یہ آپ کی "پرسشِ گاہ گاہ" بڑی تکلیف دہ چیز ہے- بمبئی کی اُس تحریر کے بعد، جس کا جواب براہ راست آپ تک نہ پہونچ سکتا تھا، آپ نے بالکل خاموشی اختیار کرلی- میں متفکر تھا کہ آپ کی صحت کی خبر کیونکر معلوم کروں آپ کی وہ باتیں جو انسان کو پروانہ کی طرح "نیمۂ داغ و نیمۂ خاکستر" بنا دیتی ہیں، کس طرح سنوں، لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی، آخر کار مایوس ہوگیا- اب کئی مہینے کے بعد آپ نے پھر یاد فرمایا لیکن نہایت رواروی میں، جس طرح سرِ راہ کسی سے ملاقات ہوجائے- یہ کیا ادا ہے، میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں

شکر ہے کہ آپ اب صحیح و توانا ہیں- میں بھی اچھا ہوں لیکن جس وقت یہ دیکھتا ہوں کہ:-

"موسمِ دیر غنودن بہ شبستاں آمد" اور اس کا کوئی سامان موجود نہیں تو پھر مضمحل ہوجاتا ہوں- کیا آپ نے کبھی داغ کے اس شعر پر غور کیا ہے:-

چمپا کھِلا گلاب کھِلا موتیا کھلی
دل کی کلی نہ تجھ سے مگر اے صبا کھلی

اس شعر میں مجھے صرف "تجھ سے" کی تفسیر آپ سے پوچھنا ہے- لیکن نتیجہ معلوم!

پردہ ڈالا ہے وہ تو نے کہ اُٹھائے نہ بنے

خوش رہئے، اور کیا کہوں

قبلۂ دلِ مستمنداں،

تاخیرِ جواب پر شرمندہ ہوں، لیکن میں اس دوران میں ہرگز اس قابل نہ تھا کہ فرمانِ گرامی کی تعمیل کرسکتا اور یوں کوئی عریضہ پیش کرنا مناسب نہ تھا

میں نے سب سے پہلی فرصت میں ان کو بلا کر آپ کا پیغام پہونچایا اور وہ تمام صورتیں جو تکمیلِ مقصد کیلئے ضروری ہیں ان کو اچھی طرح سمجھا دیں- وہ پہلے ہی سے مطمئن تھے، لیکن اب تو انھیں بالکل یقین ہے اور مجھے امید ہے کہ جناب کی خواہش کے مطابق تمام مراحل طے پاجائیں گے

میں ضرور آیندہ دسمبر میں حاضری کی کوشش کروں گا- اس سے زیادہ سعادت اور کیا ہوسکتی ہے کہ چند ساعتیں آپ کی صحبت میں گزر جائیں

صدیقی ، میں سمجھتا تھا کہ آپ کی رنگین مزاجیاں ضرور کوئی نہ کوئی گل کھلائیں گی، لیکن یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ یہ دولت اتنی مستعجل ثابت ہوگی - آپ نے تو نہیں لکھا، لیکن مجھے کسی طرح معلوم ہو ہی گیا کہ قصور آپ کا نہ تھا بلکہ اُن کا تھا - بہرحال یہ بحث فضول ہے کہ جو کچھ ہوا وہ کیونکر ہوا، اب سوچنا یہ ہے کہ آیندہ کیا ہوگا - میری رائے اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی، حیرت ہے کہ عنقا کے آپ قایل نہیں، کیمیا پر آپ کا اعتقاد نہیں، لیکن اُن سے وفا کی امید ضرور رکھتے ہیں

اخلاق کی تباہی بھی کم افسوسناک نہیں، لیکن جب اس کے ساتھ عزت و دولت بھی شامل ہو جائے تو پھر "گریہ و ماتم" سے بھی کافی اظہار تاسف نہیں ہو سکتا - اگر دل گوارا کرے تو چند دن کے لئے کہیں چلے جایئے جب "لاحول" سے کام نہ چلے تو "ماحول" بدل دینا ضروری ہے

مکرمی - آپ نے بالکل صحیح لکھا کہ مومن کا سمجھنا آسان نہیں - میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس کا پڑھنا بھی آسان نہیں - اس کے اشعار کا لب و لہجہ خاص ہوتا ہے اور جب تک اسی انداز سے ان کو نہ پڑھا جائے مفہوم پیدا نہیں ہوتا - ان کا مشہور شعر ہے :-

ان سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی
مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا

پہلے مصرعہ کو معمولی لہجہ میں پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ مومن لوگوں کو منع کر رہا ہے کہ اُس کی پری وش کو کوئی نہ دیکھے حیرت و استعجاب کے لہجہ میں پڑھیں تو مفہوم واضح ہو جائے گا یعنی میں نے تو اس کی طرف اس لئے نہ دیکھا تھا کہ رازِ محبت ظاہر نہ ہو، لیکن میری یہ احتیاط ہی رسوائی کا باعث ہو گئی کیونکہ ایسے پری وش کو نہ دیکھنا کیا معنی -

غالب کے ہاں نازک خیالی کی کمی نہیں، لیکن تغزل سے کبھی کبھی ہٹ جاتا ہے - یہاں تک کہ جب وہ اس سے ہٹ کر فلسفہ طرازی سے کام لیتا ہے تو بالکل چوبِ خشک ہو جاتا ہے، لیکن مومن کا لوچ وہی رہتا ہے - زندگی اور غم دونوں کا لازم ملزوم ہونا غالب نے اس طرح بیان کیا ہے :-

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

بالکل حدیقۂ حکیم سنائی یا پند نامہ عطار کی چیز معلوم ہوتی ہے - لیکن مومن اس خیال کو اس طرح ظاہر کرتا ہے :-

چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں، قیدِ حیات ہے

مفہوم و طرزِ ادا دونوں میں غالب سے بڑھ گیا

مکر شاعرانہ میں تو خیر مومن کا کوئی ہمسر پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ رنگ اسی کی ایجاد تھا اور اسی پر ختم ہو گیا۔ غالب کے یہاں بھی اس کی بعض مثالیں مل جاتی ہیں، لیکن مومن کے تیور کچھ اور ہی ہیں۔ غالب کا مشہور شعر ہے:۔

بہرا ہوں میں تو چاہئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

یہ مکر شاعرانہ ہے، لیکن مومن نے اس سلسلہ میں عجیب شاعرانہ نزاکتیں پیدا کی ہیں، کہتا ہے:۔

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

مومن چاہتے ہیں کہ معشوق دشمن کی طرف نہ دیکھا کرے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ کیوں ماننے لگا اس لئے مومن نے یہ بہانہ پیدا کیا۔ اسی رنگ کے دو شعر اور سنئے:۔

خواہش مرگ ہو اتنا نہ ستا ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

درباں کو آنے دینے پر میرے نہ کیجئے قتل
ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

مومن کی حقیقی شاعری کا جوہر طنزیات میں کھلتا ہے، یا پھر جلی کٹی میں

طنزیات کے بعض شعر ملاحظہ ہوں:۔

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

رشک دشمن بہانہ تھا، سچ ہے
میں نے ہی تم سے بیوفائی کی

دوسرے رنگ کے لئے اس کی چھوٹی زمینیں دیکھئے:۔

اب اور سے لو لگائیں گے ہم
جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

سر دوشِ عدو پہ رکھ کے بیٹھے
جانا نہ کہ سر اُٹھائیں گے ہم

گر تیری طرف کو بیقراری
کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

بتخانۂ چیں ہو گو ترا گھر
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

مطلوب ہیں

نگار جنوری ۱۹۲۷ء۔ نومبر ۱۹۳۳ء۔ جنوری و اپریل تا ستمبر۔ نومبر و دسمبر ۱۹۳۴ء۔ جون ۱۹۳۵ء۔ مئی و اگست ۱۹۳۶ء فروری۔ دسمبر ۱۹۳۷ء کے نگار کے پرچے جو صاحب علٰحدہ کرنا چاہیں، دفتر کو اطلاع دیں۔
منیجر نگار لکھنؤ

سیاسیات یورپ

(۱۰)

انگلستان

برطانیہ کا نظام حکومت اسقدر عجیب و غریب ہے کہ نہ اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں ملتی ہے، نہ اسکی نوعیت کے لحاظ سے اس کا کوئی خاص نام رکھا جاسکتا ہے، وہ بیک وقت ملوکیت بھی ہے، حکومت اعیان (Oligarchy) بھی اور آزاد ڈماکریسی بھی۔ اس کو سمجھنے کے لئے وہاں کی تقسیم دولت پر ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔

انگلستان میں صاحب ملکیت جماعت صرف دو فی صدی ہے لیکن قومی دولت کا ۶۴ فی صدی حصہ انکے پاس ہے، یہی جماعت فی الحقیقت یہاں کی حکمراں جماعت ہے، جو دنیا کے تمام بازاروں پر قابض ہے اور دارالعوام و دارالخواص کو اپنا کلب جانتی ہے۔

ان کی حکومت کی بنیاد تین قوتوں پر قایم ہے، بحری اقتدار، بینک آف انگلینڈ اور سول سروس۔ اور قومی آمدنی کے بڑے حصہ پر انھیں کو اختیار حاصل ہے۔ وہاں کی غیر متوازن تقسیم دولت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ویسٹ اینڈ کا صرف ایک امیر ۷۰۰ ایکڑ زمین کا مالک ہے۔

لندن کی ۸۰ لاکھ آبادی میں صرف ۴۰ لاکھ افراد ایسے ہیں جو صاحب ملکیت ہیں اور ان میں بھی صرف ۲۰ ایسے ہیں جو واقعی قیمتی زمین کے مالک ہیں۔ انگلستان میں ایک لاکھ مرد عورت ایسے ہیں جن کی آمدنی دو ہزار پونڈ سالانہ سے زیادہ ہے اور قومی دولت ۱۶ فی صدی ان کے قبضہ میں ہے اور ایک کرور اسی لاکھ ایسے ہیں جن کی آمدنی ۲۵۰ پونڈ سالانہ سے کم ہے اور ۵۶ فی صدی قومی دولت ان کے قبضہ میں ہے۔ انگلستان میں جو لوگ مرتے ہیں انہیں صرف چوتھائی ایسے ہوتے ہیں جو سو پونڈ کی ملکیت اپنے بعد چھوڑ جاتے ہوں۔

دارالعوام میں سرمایہ داری کی بڑی زبردست مرکزیت پائی جاتی ہے۔ ۱۹۳۴ء میں دارالعوام کے ۱۷۰ ممبر ۶۵۰ کمپنیوں کے ڈائرکٹر تھے اور ایک ممبر پارلیمنٹ تو ۴۳ کمپنیوں کا ڈائرکٹر تھا۔ دارالامرا (ہاؤس آف لارڈز) میں ۷۲۹ امرا، ہیں جن میں ۲۴۶ بڑے زمیندار ہیں، ۱۱۲ بیمہ کمپنیوں کے ڈائرکٹر ہیں، ۴۷ صرافہ کے کاروبار کے ڈائرکٹر ہیں، ۶۷ بنکوں کے ڈائرکٹر ہیں، ۶۴ ریلوے کمپنیوں کے اور ۴۹ جہاز بنانے والی کمپنیوں کے۔ اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ منجملہ ۷۲۹ امرا کے نصف سے زیادہ ایسے ہیں، جنھوں نے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۱ء تک کسی مباحثہ میں حصہ نہیں لیا اور ۱۱۱ نے کسی اخلاقی مسئلہ میں کوئی رائے نہیں دی۔ اسی طرح گویا اوسطاً صرف ۸۳ امرا نے کام میں حصہ لیا۔

انگریزی قوم ہر چند بہت سی قوموں کا مجموعہ ہے لیکن انگلستان کی جائے وقوع اور اس کی جغرافی خصوصیت نے سب کا نقطۂ نظر ایک ہی کر دیا ہے۔ ایک جزیرہ کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے ان میں بہت پیش بینی پیدا ہوگئی ہے اور وطنیت کا جذبہ قوی ہوگیا ہے۔

انگلستان اپنی پیداوار کے لحاظ سے زیادہ خوش قسمت نہیں ہے، وہ اپنی غذائی ضرورتوں کا صرف ۲/۵ حصہ پیدا کر سکتا ہے اور خام پیداوار جس پر اسکی صنعت و حرفت قایم ہے وہاں صرف ۲۰ فی صدی ہوتی ہے۔ لوہا، کویلہ، اور فولاد البتہ وہاں بہت کافی پیدا ہوتا ہے، اسی لئے وہ یوروپ بھر میں سب سے بڑا صنعتی ملک مانا جاتا ہے اور اس کی تجارت ۴۰ فی صدی برآمد کی تجارت ہے۔

وہاں کی حکمراں جماعت سب کی سب تجارت کرتی ہے اور اسی سے دولت کماتی ہے۔ انگریزی قوم تجارت کا اتنا زبردست احساس رکھتی ہے کہ کمائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ یہاں تک کہ شاہی جواہرات سے بھی کچھ نہ کچھ فایدہ اُٹھا لیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ اُن کے دیکھنے کے لئے بھی چھ پنس ادا کرنے پڑتے ہیں۔ مشہور ہے کہ ایک انگریز ہفتہ میں چھ دن بنک انگلستان کی پوجا کرتا ہے اور صرف ایک دن گرجا کی اور یہ بھی اس لئے کہ وہاں مذہب کی قوت بڑی حد تک ہنوز باقی ہے۔

وہاں آزادی کا احساس بھی بڑا قوی ہے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے انھوں نے فرانسیسیوں کی طرح بڑی قیمت ادا کی ہے، یہاں تک کہ متعدد بادشاہوں کی گردنیں محض آزادی کے لئے کاٹ ڈالی گئیں۔

ویسٹ منسٹر کا پارلیمنٹری نظام اتنا عجیب و غریب ہے کہ ہر قوم اس پر رشک کرتی ہے اور بجا رشک کرتی ہے، ڈکٹیٹر شپ میں شخص واحد خادم قوم کی حیثیت رکھتا ہے اور ڈماکریٹک حکومتوں میں حکومت، افراد کی خدمت کرتی ہے، اس حقیقت کو کوئی انگریز کبھی نہیں بھولتا اور ایک کھیل کی طرح اس پر عامل ہے۔ جس وقت انتخاب کی منزل ختم ہو جاتی ہے تو دونوں مخالف اس طرح ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں، گویا یہ کوئی ٹینس کا کھیل تھا۔ جب مسٹر بالڈون پہلی مرتبہ وزیر اعظم ہوئے تو سب سے پہلے انھوں نے لارڈ آکسفورڈ ہی سے مشورہ طلب کیا جو انتخاب میں ان کے نہایت شدید

مخالف فریق تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ انگریز قوم انگلستان کے مسئلہ کو جماعتی سیاسیات سے بالکل علحدہ ہو کر دیکھتی ہے۔ جب وقت لارڈ کرزن کا انتقال ہوا (جو سخت ٹوری تھا) تو لیبر پارٹی کے ممبروں نے دار العوام میں اس کی بہت تعریف کی۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں جب ویلس کے اندر عام اسٹرایک ہوا ہے تو پولیس اور اسٹرایک کرنے والے دونوں فٹ بال ساتھ ساتھ کھیلتے تھے۔

حکومت و وطن کے ساتھ وفاداری وہاں بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی میں پائی جاتی ہے۔ باہر کے لوگ جو وہاں جاتے ہیں انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ ملک انقلاب سے کیونکر بچا ہوا ہے جہاں اتنی غیر متوازن تقسیم دولت کی پائی جاتی ہے اس وقت انگلستان میں ۲۰ لاکھ آدمی بیکار ہیں جن میں نصف ایسے ہیں جو کسی کام کے قابل نہیں ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ جب رائے دینے کا وقت آتا ہے تو ان بیکار غریبوں کی جماعت کنسرویٹو ممبری کے حق میں رائے دیتی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ متوسط طبقہ لیبر جماعت کی اہلیت کی طرف سے مطمئن نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ حکومت ان فاقہ کش غریبوں پر ۲۰ لاکھ پونڈ ہر ہفتہ صرف کر کے اُن میں بے چینی پیدا نہیں ہونے دیتی۔

حکمراں جماعت کے دست و بازو وہاں کئی ہیں۔ ایک تو بحری طاقت ہے جو بجائے خود ایک قانون کی حیثیت رکھتی ہے، دوسرے بنک جو نہایت ہی عجیب و غریب ادارہ ہے اور تیسرے وہاں کے سرکاری مدارس۔ کابینہ کے ۵۵ ممبروں میں کم از کم سولہ تو اٹون کے مشہور مدرسہ کے طالب علم ہوتے ہیں، چھ ہیرو اسکول کے اور سترہ دوسرے مدارس کے۔ یہ لوگ اس کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں کہ ان کا اسکول کسی طرح بدنام نہ ہو، چنانچہ مسٹر بالڈون نے لکھا ہے کہ جب ترتیب وزارت کی دعوت انھیں دی گئی تو انھوں نے پوری کوشش کی کہ مدرسۂ ہیرو (جہاں وہ طالب علم تھے) بدنام نہ ہو۔

اخباروں کا بھی وہاں بہت اثر ہے اور اس لئے حکمراں جماعت ہمیشہ ان کو بھی زیر اقتدار رکھتی ہے، لیکن سول سروس کا نظام سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے اور حقیقتاً یہی ریڑھ کی ہڈی سمجھی جاتی ہے۔

اس ملک کا طریق پروپاگنڈا بھی نہایت عجیب ہے۔ احتساب سے وہ بھی کام لیتے ہیں لیکن زیادہ تر جاسوسی کے ذریعہ سے۔ جبشہ کی جنگ کے وقت بحر روم میں برطانوی بیڑہ کی قوت سے ہر اخبار واقف تھا، لیکن مخالف جماعت کے اخباروں نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ انتخاب کے وقت وہاں اتنا سخت ناجائز سیاسی دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ اگر یہی صورت ترکی یا بلغاریہ میں پیش آئے تو آزاد خیال اخباروں میں ہلچل پڑ جائے۔

برطانیہ کی خارجہ پالیسی جو نسلاً بعد نسلٍ ایک ہی سی چلی آرہی ہے، صرف یہ ہے کہ مغربی سلطنتوں کی قوت متوازن رہے اور توازن کا قیام انگلستان کے ہاتھ میں ہو۔

سر آسٹن چیمبرلین نے ایک بار ظاہر کیا تھا کہ "ہماری بڑی بڑی لڑائیاں صرف اس لئے لڑی گئی تھیں کہ کسی

ایک حکومت کا اقتدار دوسری مغربی حکومتوں پر قایم نہ ہوجائے"۔ ٹریویلیان کا بیان ہے کہ "ٹیوڈروں کے زمانہ سے اسوقت تک انگلستان نے سیاسیات یوروپ سے صرف یہ کام لیا کہ وہ خود حملوں سے محفوظ رہے اور جو تدبیریں سمندر پار کے ممالک کے قبضہ کے لئے اختیار کی جاتی ہیں وہ پٹ نہ پڑیں"۔

اسی پالیسی کے تحت انگلستان کا موجودہ طرزِ عمل یہ ہے کہ اگر فرانس کسی وقت جرمنی سے زیادہ مضبوط ہوجائے تو جرمنی کی مدد کرے اور اگر کبھی جرمنی فرانس سے بڑھ جائے تو فرانس کی مدد کرے۔ چنانچہ جنگ عظیم کے بعد سے لیگ اقوام اسی پالیسی کی تکمیل کا ذریعہ بنی ہوئی ہے اور اگر کسی وقت لیگ اس مقصد کی تکمیل میں ناکام ہوئی تو برطانیہ اس کو ختم کردے گا لیکن چونکہ برطانیہ نے اپنے دیگر مقبوضات (ہندوستان وغیرہ) کو بھی اس میں علحدہ مستقل حکومتوں کی طرح شامل کرلیا ہے اس لئے لیگ پر ہمیشہ انگلستان کا اقتدار قایم رہیگا۔

جنگ سے قبل برطانیہ کی پالیسی یہ نہ تھی کہ وہ یوروپ کے آیندہ امکانی خطرات کو پیش نظر رکھکر، اپنی قوم کو کسی مخصوص طرزِ عمل پر مجبور کرے، لیکن اب انگلستان یوروپ کے آیندہ خطرات کا پہلے ہی سے بندوبست چاہتا ہے تاکہ امن و سکون کی تباہی سے اس کی تجارت متاثر نہ ہو۔ تاہم انگلستان اپنی خارجہ پالیسی کو بالکل کھیل ہی سمجھتا ہے، اہلِ جرمن و فرانس کے لئے تو سیاسیات موت و زندگی کی چیز ہے، لیکن انگلستان سمجھتا ہے کہ یوروپ ایک اسٹیج ہے جس پر ہر ایکٹر اپنا کام کررہا ہے اور اگر کسی سے کوئی غلطی ہوجائے تو سمجھنا چاہئے کہ یہ صرف ادہر سل تھا اور دوبارہ کوشش کرکے اس غلطی کو دور کرنا چاہئے۔

انگلستان کے دفترِ خارجہ میں دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو لیگ اقوام کا طرفدار ہے اور یوروپ میں قیام امن و سکون کے خیال سے ایک متحدہ ذمہ داری پیدا کرنے کے لئے جرمنی کو بھی دول عظمیٰ کی صف میں شامل کرنا چاہتا ہے یہ گروہ لڑائی کے نام سے کانپ اٹھتا ہے اور حبشہ کی جنگ کو اس نے اخلاقی قانون کی خلاف ورزی سمجھا۔ دوسرا گروہ جس میں زرا معمر آدمی شامل ہیں، وہ ان تمام جھگڑوں سے علحدہ ہوکر صرف یہ چاہتا ہے کہ بحری قوت کو بڑھایا جائے اور خواہ مخواہ دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دیا جائے۔ چنانچہ اس جماعت کی یہی پالیسی تھی جس نے جرمنی کو اتنے ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقعہ دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ہٹلر کی آمریت کے بعد بھی انگلستان میں جرمنی کی طرفداری کا جذبہ بہت قوی پایا جاتا ہے۔ اور اس کے متعدد اسباب ہیں۔

۱- انگلستان کی ٹوری جماعت، بالشیوزم سے بہت خایف ہے اور اپنی حماقت سے اس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہٹلر اس امر کی گارنٹی ہے کہ یہ تحریک مغرب کی طرف نہ بڑھے گی۔ اس لئے انگلستان اور جرمنی کو متحد رہنا چاہئے۔

۲- انگلستان اور خصوصیت کے ساتھ لندن والوں کا بہت سا روپیہ جرمن کاروبار میں لگا ہوا ہے، اسلئے اس سے

لڑائی مول لینا ایک بڑے سرمایہ کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔

۳- انگلستان کے بہت سے صاحب اقتدار ایسے ہیں جو فرانس اور فرانسیسیوں سے نفرت کرتے ہیں اور اسلئے وہ قدرتاً جرمنی کی طرف مایل ہیں۔

۴- لارڈ لوتھین اور ان کے حواریین کا خیال ہے کہ یورپ میں امن و سکون صرف اسی طرح قایم رہ سکتا ہے کہ جرمنی مضبوط رہے اور ہٹلر کا ساتھ دینا گویا جرمنی کو مضبوط بنانا ہے۔

۵- وہاں کے اخبارات ہر چند نازی تحریک کو پسند نہیں کرتے لیکن بالشیویت یا اشتراکیت کو اس سے بھی بُرا جانتے ہیں اور اس لئے وہ روس کے مقابلہ میں ہٹلر کی طرفداری کو پسند کرتے ہیں۔

۶- انگلستان میں عام میلان لوگوں کا یہی ہے کہ گو جرمن مغلوب دشمن ہے لیکن ہے قابل عزت۔

۷- لیبر پارٹی میں بھی جماعتیں جرمن کی طرفدار ہیں۔

اس لئے اگر کسی وقت جرمن کے خلاف یورپ میں جنگ چھڑی تو یہ تمام اثرات ضرور اپنا کام کرینگے اور چونکہ ہٹلر یہ سمجھتا ہے کہ انگلستان کا نیوٹرل رہنا ناممکن نہیں ہے اس لئے اس کی ہمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔

جرمنی کے ساتھ انگلستان کی پالیسی کا رُخ ۳۵ء کے بحری معاہدہ سے ظاہر ہو جاتا ہے جس کی رو سے اگر جرمن اپنی فوجی طاقت بڑھا سکتا ہے تو دوسری طرف برطانیہ بھی اپنی ہوائی طاقت کو سہ چند کر سکتا ہے اور تجارت میں جرمن مسابقت کی طرف سے مطمئن ہو جاتا ہے۔

۱۹۱۴ء میں برطانیہ نے جرمنی کے خلاف محض فرانس یا بلجیم کی ہمدردی میں جنگ نہیں کی تھی، بلکہ سبب یہ تھا کہ دنیا کے بازاروں میں جرمنی نے انگلستان کو پیچھے ڈھکیل دیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ انگلستان کی تجارتی کساد بازاری بڑھ گئی تھی اور بیکاروں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ اب یہی اندیشہ جاپان کی طرف سے پیدا ہو گیا ہے، لیکن انگلستان اس سے براہ راست جنگ نہیں کرنا چاہتا، اس لئے چاہتا ہے کہ جرمنی کو مضبوط کر دیا جائے تاکہ جاپان اس کے ساتھ ملکر روس پر حملہ کرے اور اس طرح آخر کار یہ تینوں قوتیں کمزور ہو جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ انگلستان بڑی حد تک جرمن کا طرفدار ہے، لیکن وہ جرمن کے خلاف اپنے آپ کو پوری طرح مسلح کرنے سے بھی غافل نہیں ہے، کیونکہ اسے اگر کسی کی طرف سے اندیشہ ہے تو وہ جرمنی ہی ہے، اسلئے برطانیہ کی خارجہ پالیسی کا صحیح علم اسوقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کے مسلح ہونے کا زبردست پروگرام پورا نہیں ہو جاتا اب تو وہاں بحری قوت بڑھائی جا رہی ہے، ہوائی طاقت پر بیدریغ دولت صرف ہو رہی ہے، ہلاکت بار آلاتِ حرب پر آنکھ بند کر کے روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے اور جب یہ سب کچھ ہو چکے گا تو معلوم ہو گا کہ انگلستان کا صحیح ارادہ کیا ہے اور وہ یورپ میں کس کو باقی رکھنا چاہتا ہے اور کس کو پامال کر دینا۔

آمرِ جرمنی کی داستانِ عشق

یورپ کی موجودہ فضائے سیاست جن روشن اور تابناک ستاروں سے مزین ہے اس میں جرمنی کے آمرِ اعظم اڈالف ہر ہٹلر کی ذات خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے اس کی سیاسی فراست نے اس کے نام کو "روم برلن محور" سے ہمیشہ کے لئے وابستہ کردیا ہے جس کے زور پر اس نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالکر رائن، اسٹریا اور زیکوسلوویکیا کے ایک حصہ کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔ یہ ہٹلر کی شدید خود اعتمادی کی دلیل ہے کہ اس نے لوکارنو اور ورسیلز کے عہدناموں کو پس پشت ڈالکر برطانیہ اور فرانس کے ہاتھوں سے وہ اقتدار چھین لیا جس کے دینے کے لئے وہ خوشی سے آمادہ نہ تھے اس طرح اِن دو جمہوری طاقتوں کا اثر زائل کرنے اور یوروپ کے توازنِ ملکی کے برباد کرنے میں ہٹلر نے بڑی مدد دی ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اس نے یہ جو کچھ حاصل کیا وہ اخلاقی اُصولوں کی قربانی کرکے حاصل کیا لیکن نازیت اور فسطائیت اخلاقی اُصولوں سے یکسر مبرّا ہیں، اُن کی کتابِ سیاست میں ایفائے وعدہ سے زیادہ عہد شکنی میں اخلاقی شان مضمر ہے، وہاں طریقۂ کار کے بجائے نتیجہ سے بحث ہوتی ہے اور آغاز سے زیادہ انجام پر زور دیا جاتا ہے یہ سب باتیں اپنی جگہ صحیح و درست سہی لیکن اس حقیقت سے بھی مشکل سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ ہٹلر نے جرمنی میں ایک حیات آفریں صور پھونک دیا ہے اس کے بچہ بچہ میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کردی ہے۔ اب جرمنی ایک حقیقت ہے ایک صداقت ہے، اس کے معاشی و فوجی وسایل اور ذرایع بہت وسیع ہوگئے ہیں، اس کی ہوائی طاقت انگلستان و فرانس کی متحدہ طاقت سے کہیں زیادہ بہتر ہے اور یہ سب کچھ ایک شخص۔ یعنی ہر ہٹلر کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ہٹلر اپنے عادات و خصائل کے لحاظ سے اتنا "سنگین" اور "آہنی" قسم کا انسان معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اسکے اوپر خدنگِ عشق کا کوئی اثر ہو ہی نہیں سکتا اور ہمارے ذہن میں اس کے کسی سے محبت کرنے کا مفہوم آتا ہی نہیں، لیکن حسن و عشق کی دار و گیر عام ہے اور محبت کی جنوں زائیاں کسی خاص شخص، نوع، مقام اور وقت کے لئے مختص نہیں۔ محبت کے دیوتا نے "لوہے کے انسانوں" اور شاہانِ جم مرتبت سبھی کو جب چاہا ہے، نوازا ہے، دردِ محبت کی تقسیم میں خدائے عشق نے فقیر و امیر کی تخصیص قطعاً نہیں کی ہے، ہٹلر نے بھی نپولین کی طرح عشق

میں کافی شدت والتہاب کا ثبوت دیا ہے، اس کے بعض افسانہائے محبت اسی وجہ سے اپنے اندر کافی جاذبیت رکھتے ہیں، لیکن اس کی فتادگی نے اس کے سپاہیانہ جذبات کو کبھی ماند نہیں ہونے دیا ہے۔

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں، معمولی لوگوں کے کانوں تک اُن کی بھنک بھی نہیں پہونچتی، ڈیوک آف ونڈسر سابق ایڈورڈ ہشتم کی محبت کا ذکر انگلستان کے اخبارات میں بہت کم آیا، امریکن اخبارات البتہ اسکے اوپر ہنگامہ مچاتے رہے لیکن یہ تمام قصہ انگلستان کی پبلک کے سامنے کماحقہٗ اسوقت آیا جبکہ وہ اپنی تمام نیازمندیاں "ناز" کی خدمتمیں پیش کر چکے تھے اور ایک ہستی کی خاطر تاج و تختِ کو پائے استحقار سے ٹھکرا چکے تھے، آمرینِ یورپ کی "پس پردہ" زندگی کا بھی ہمیں بہت تھوڑا علم ہے خصوصاً جرمنی کے مقابلہ میں ہماری "بے علمی" بڑی قابلِ رحم ہے، ہمیں جو کچھ وہاں کے حالات معلوم ہوئے ہیں وہ یا تو اُن خبروں کے ذریعہ جو جرمنی سے تار کے ذریعہ دوسرے ملکوں میں بھیجی جاتی ہیں یا پھر ہٹلر کی سوانحعمری کے ذریعہ، یا اُن سیاحوں کے ذریعہ جو تفریح کے طور پر یا وہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے جاتے ہیں، یہ خبریں عام طور پر گپ اور پروپیگنڈے کی حیثیت رکھتی ہیں اور حقایق تک پہونچنے کے لئے بڑی چھان بین کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن کچھ نامہ نگاروں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ان آمرینِ یورپ کے اندرونی حالات کی نقاب کشائی کی ہے، ان لوگوں میں فرڈمان جو ایک امریکن ہے اور جینن جو فرانسیسی ہے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں لیکن ہٹلر کے نجی معاملات کی پردہ کشائی جس نامہ نگار نے کی ہے وہ ایک عورت ہے اور وہ شہزادی کیتھرائن ریڈزی ول (Princess Catherine Radziwill.) کے نام سے مشہور ہے اس نے جو کچھ معلومات حاصل کی ہے وہ جرمنی اور آسٹریا کی اُن عورتوں سے حاصل کی ہے جو وہاں کی سوسائٹی میں بڑی مقتدر اور با اثر ہیں۔

ہٹلر کی سوانح عمری (Mein kemp)، عورتوں کے ذکر سے یکسر خالی ہے اس میں گویا عورتوں کے وجود ہی کو قطعاً تسلیم نہیں کیا گیا، لیکن بہت سی مثالیں اس کی شاہد ہیں اور بہت سے مواقع ایسے آئے ہیں کہ جب ہٹلر اس نتیجہ پر پہونچنے پہ مجبور ہوا ہے کہ عورت کائنات کی غیر ضروری تخلیق نہیں ہے اور اگر اسے دنیا سے علٰحدہ کر دیا جائے تو یہ کائنات عالم یکسر ویران و سنسان نظر آنے لگے۔

ہٹلر نے بہت سی محبتیں کی ہیں، شروع زمانہ میں جو لڑکی اس کے دل و دماغ پر مسلط رہی ہے وہ اسکی بھانجی "گریٹ رابل" (Grete Raubal) تھی، وہ شمالی آسٹریا کے دیہاتی علاقہ کی رہنے والی تھی، ہٹلر اسی زمانہ میں "بطلِ میونک" (Munich) سمجھا جاتا تھا اسی وجہ گریٹ بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی اور اس کے حضور میں سراپا عبودیت بنی ہوئی تھی، ہٹلر کو بھی اس سے بےحد محبت تھی لیکن اس کی وجہ سے وہ کبھی اپنے معمولات میں فرق نہیں ڈالتا تھا، وہ اسے فرطِ محبت سے گیلی کہتا اور گریٹ لے

"چچا الف" کہتی تھی، ہٹلر کو جب کبھی انتظامی اور جنگی مصروفیتوں سے مہلت ملتی وہ اپنا وقت گیلی کے پاس صرف کرتا اس نے اپنی ایسی بہت سی فرصتیں جب آسمان پر "ملکۂ عرش" بے نقاب ہوتی، تارے شبگیر ہوتے، چڑیاں زمزمہ صبحگاہی چھیڑتی ہوتیں اور موجیں اپنا ساز درست کرتی ہوتیں، اپنی محبوبہ گیلی کے ساتھ گزاریں دنیا نے ان سب باتوں کو دیکھا، لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں لیکن ہٹلر کے آگے کون دم مار سکتا تھا، وہ اب نازیوں کا "انسان اعظم" تھا اسے اس بات سے بیحد کوفت ہوئی کہ کوئی اس کی نجی زندگی سے کیوں واسطہ رکھے، یہ کسی کو نہیں معلوم کہ اس نے اس برہمی کا اظہار "گریٹ رابل" پر بھی کیا یا نہیں لیکن ہاں اتنا معلوم ہے کہ ۱۹۲۸ء کی ایک صبح کو گیلی نے خودکشی کرلی!

اس واقعہ کے بعد سے ہٹلر کے مزاج میں سختی پیدا ہوتی گئی، کیتھرائن نے لکھا ہے کہ گیلی کی خودکشی اسکے مزاج کی "آہنیت" کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ اس کے بعد سے اس کے لب و لہجہ کا کھرا پن اور اسکی طبیعت کی درشتگی بڑھ گئی لیکن ہٹلر نے گیلی کی موت کو بری طرح محسوس کیا اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے جرمنی کے سب سے بڑے نقاش "زیگ لر" کو حکم دیا کہ وہ گیلی کی ایسی تصویر بنا دے جو اس کے نام کو بقائے دوام بخش دے جب وہ تصویر بن کر آئی تو ہٹلر اسکے سامنے انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ بے اختیارانہ جھک گیا اور جب اُٹھا تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد ہٹلر کو ایک سینما اسٹار رے نیٹ ملر (Renate Muller) سے محبت ہوگئی، جنرل گوئرنگ نے ایک دعوت کی جس میں ہٹلر کی رے نیٹ سے ملاقات ہوئی جب دعوت ختم ہونے والی تھی اُسوقت گوئرنگ ہٹلر کو رے نیٹ کے ساتھ تنہا چھوڑ کر کمرہ سے باہر چلا گیا، معلوم نہیں دونوں میں کیا گفتگو ہوئی اور کن معاملات پر بحث ہوئی لیکن کچھ دنوں کے بعد اتنا ضرور سننے میں آیا کہ رے نیٹ ایک یہودی سے بڑی شدومد سے محبت کر رہی ہے اور یہ بات ہٹلر اور گوئرنگ دونوں کو سخت ناگوار ہے ۔ گوئرنگ اور اس کے دوستوں نے رے نیٹ کو سمجھایا کہ وہ ایک یہودی سے محبت کرکے بڑی سخت غلطی کا ارتکاب کر رہی ہے انھوں نے اُسے یہ بھی بتلایا کہ یہ صورت خطرہ سے خالی نہیں، ری نیٹ یہ دیکھکر جرمنی سے باہر چلی گئی اور اُس یہودی سے شادی کرلی لیکن اسے جرمنی واپس آنے پر مجبور کیا گیا اور اس پر زور دیا گیا کہ وہ اپنے فلم کے ٹھیکے پورے کرے ورنہ اسے سزا دیجائے گی، جرمنی میں وہ بالکل "اشک داد خواہ" تھی سراپا مظلومیت کی تمثیل، آخر اس نے ان زیادتیوں سے تنگ آکر خودکشی کا ارادہ کیا اور ۵۰ فٹ کی بلندی سے کود پڑی لیکن عجیب اتفاق تھا کہ وہ مری نہیں، ڈاکٹروں کو اس کی زندگی کی پوری امید تھی لیکن وہ خود اپنی زندگی سے بیزار ہوچکی تھی، اب وہ زندہ رہتی بھی تو اس کے لئے بیکار تھا، آخر ایک دن اخباروں نے اعلان کر دیا کہ ری نیٹ اس دنیا سے رخصت ہوگئی، اسوقت تیسری ریش (Reich) برسر اقتدار تھی۔ ہٹلر نے اسکے بعد ایک اور لڑکی سے محبت کی اس نے بھی گریٹ اور ری نیٹ کی طرح تاریخی اہمیت حاصل کرلی ہے ۔ اسکی تیسری محبوبہ کا نام "لینی رفنستال" (Leni Riefenstall) ہے اور وہ ایک یہودی لڑکی ہے!! ــــ وہ بویریا کی رہنے والی نہایت حسین وجمیل لڑکی ہے اور اس وقت جرمنی کی ممتاز ترین

ایکٹریسوں میں شمار کی جاتی ہے، اسی یہودی لڑکی اور آمرِ جرمنی میں نہایت شدید محبت ہے، ہٹلر اپنی خستگی دور کرنے کے لئے لینی (Lenne) ہی کے نرم و نازک ہاتھ کا متمنی رہتا ہے۔ ہٹلر اور ایک یہودی لڑکی سے محبت کرے! یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی، دنیا کو اس محبت پر حیرت ہے، وہ یہودیوں کے خون کا پیاسا ہے لیکن اسی مطعون قوم کے ایک فرد کے لئے وہ بیتاب ہے، یہ بات عام لوگوں کے لئے شدید استعجاب کا باعث ہے لیکن عشق و محبت کی دنیا میں سیاسی اور نسلی تعصبات حائل نہیں ہوتے۔ ایک مرتبہ گوئرنگ نے ہٹلر کو اس حرکت پر بہت ملامت کی، "آپ بہت ہی ناعاقبت اندیشی سے کام لے رہے ہیں۔ اس یہودی لڑکی کو چھوڑیئے، تمام سلطنت میں اس کی وجہ سے چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں" لیکن ہٹلر نے نہایت سختی کے ساتھ جواب دیا "گوئرنگ! میرے نجی معاملات تم سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، اگر تم انہیں دخل دوگے تو بڑی گستاخی کروگے۔ اس بات کو ہمیشہ کیلئے گرہ میں باندھ لو"۔ گوئرنگ نے اسکے بعد دوسری ترکیب سوچی، اس نے لینی کو دھمکایا کہ وہ ہٹلر کا پیچھا چھوڑ دے اور اس کی محبت سے باز آجائے ورنہ اسکی زندگی کو ختم کر دیا جائے گا، ہٹلر کی محبوبہ بھلا کب دبنے والی تھی اس نے صاف صاف کہدیا کہ "گوئرنگ! تم یہ خبط اپنے دماغ سے نکال دو، تمہارا راستہ ہے تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ"۔ لینی نے اُسی وقت ٹیلیفون کیا اور کہا کہ "ہٹلر فوراً یہاں آؤ، مجھے بڑا ضروری کام ہے۔ ہاں، اور وہ کام تمہارے لئے بھی ضروری ہے"۔ ہٹلر نے فوراً تعمیل کی، لینی (Lenne) اس کو دیکھتے ہی اسکی آغوش میں گر پڑی اور رونے لگی، اُس نے آمرِ جرمنی کو اُن تمام خطرات سے آگاہ کیا جو اُس کی اور ہٹلر کی جان کے لئے پیدا ہو رہے تھے، ہٹلر نے اپنی بھاری آواز میں اُس کو تسکین دیتے ہوئے کہا "لینی! مت گھبراؤ، مجھے اور تمہیں سوائے موت کے اور کوئی چیز علٰحدہ نہیں کر سکتی"۔ ہٹلر کی یہ محبت جاری ہے اور اس کی یہود دشمنی بھی اسی طرح برقرار ہے اس محبت کا انجام کسی کو نہیں معلوم اگرچہ سب لوگوں کو اس کا انتظار ہے، ممکن ہے یہ محبت کچھ تاریخی امکانات اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہو اور یہودیوں کے ساتھ وہ جانوروں کا سا سلوک، جو جرمنی کی سرزمین پر روا رکھا جارہا ہے، کچھ کم ہوجائے، لیکن کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ اس لئے کہ ابھی چودہ ہزار یہودی محض ایک ہِروان راتھ کے قتل کے جرم میں گرفتار کئے ہیں اُن کے تمام مدارس، معابد، اخبارات، رقص گاہیں تھیٹر اور سینما بند کردئے گئے ہیں اور اُن کے اوپر جیسا عرصۂ حیات آج جرمنی میں تنگ ہے اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔

خواجہ احمد فاروقی، بی۔اے

فلسفۂ مذہب

اِس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت عہ رعایتی ۱۲ر محصول علاوہ
مینجر نگار بک ایجنسی

باب الاستفسار

خضر — کافر

(جناب سید علی رضا صاحب - دہلی)

یوسف رضا صاحب بدایونی کا ایک مقالہ جوش پر آپ کے رسالہ میں شایع ہوا ہے، اس کے دوسرے حصہ میں انھوں نے بعض اعتراضات بھی کئے ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ خضر، نظر اور شرر کا ہم قافیہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ اصل لفظ خِضر یا خَضِر ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کافر کو سخنور کا ہم قافیہ قرار دیا ہے، حالانکہ صحیح تلفظ اس کا کافِر ہے۔

آپ نے اپنی کوئی رائے ان اعتراضات کی بابت نہیں درج کی۔ براہ کرم مطلع فرمائیے کہ آپ کا فیصلہ اس باب میں کیا ہے۔

(نگار) خضر اور کافر دونوں عربی لفظ ہیں۔ خضر کے تلفظ دو ہیں۔ خِضر بروزن مِصر اور دوسرا خَضِر بروزن فعل جس کے معنے ہیں سبز و شاداب کے، لیکن اس غیر معلوم ہستی کے لئے جس کا ذکر موسیٰ کے ذکر کے ساتھ کلام مجید میں آیا ہے اور جسے عوام پیغمبر بھی سمجھتے ہیں، خِضر (بروزن فِعل) اور خَضِر (بروزن فَعِل) دونوں کا استعمال ہوا ہے اس لئے میری رائے میں جوش نے غلطی نہیں کی ہے۔

کافر کے تلفظ کو ہر شخص جانتا ہے کہ وہ بروزن کاہل ہے، لیکن اردو فارسی والوں نے کبھی کبھی بہ فتح فا بھی استعمال کیا ہے میری رائے میں اس سے اجتناب اولیٰ ہے، کیونکہ اس میں عامیانہ انداز زیادہ پایا جاتا ہے۔

یہود اور صیہونیت

(جناب اسد اللہ خانصاحب - مرزا پور)

آجکل فلسطین میں یہودیوں کی وجہ سے ہنگامہ برپا ہے اور ہٹلر نے اپنے ملک سے ان کو نکالکر دنیا کی توجہ ان کی طرف پھیر دی ہے۔ اسی سلسلہ میں صیہونیت کا بھی بار بار ذکر آتا ہے۔ کیا آپ مہربانی فرما کر یہودیوں کی تاریخ کے متعلق مختصر الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے، نیز یہ کہ صیہونیت کیا چیز ہے

(نگار) یہود سامی النسل قوم ہے جو اسوقت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ انگریزی میں انھیں (Jews) کہتے ہیں جس کے معنے ہیں (A man of judge) اسی کا مترادف (Hebrew) ہے۔ یہودیوں کی ابتدائی تاریخ توریت میں بیان کی گئی ہے، لیکن آثاری تحقیقات کی بنا پر اس میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوگیا ہے۔ اس قوم نے حضرت ابراہیم کی سیادت میں ۲۰۰۰ سال قبل مسیح عراق سے فلسطین ہجرت کی۔ اس کے ۵۰۰ سال بعد یہ اپنے مویشی لیکر مصر چلے گئے، یہاں ان کو سخت ایذائیں دی گئیں اس لئے حضرت موسیٰ کی سرکردگی میں یہ پھر وہاں سے پلٹے اور ۴۰ سال تک پہاڑوں اور جنگلوں میں آوارہ پھرتے رہے۔

جب یہ کنعان پہونچے جسے اب فلسطین کہتے ہیں تو یہاں کی قوموں کو انھوں نے مغلوب کیا اور پھر اسی سرزمین میں آباد ہوگئے جس کو صدیوں قبل یہ چھوڑ چکے تھے۔ انھوں نے اس حصۂ زمین کو اپنے بارہ قبایل کے درمیان تقسیم کرلیا جو یعقوب کے بیٹوں یا پوتوں کے نام سے موسوم تھے۔ اس وقت انکا کوئی بادشاہ نہ تھا بلکہ ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا جو سرپنچ کی حیثیت سے تمام انتظام کرتا تھا۔ لیکن بعد کو انھوں نے اپنا ایک بادشاہ تجویز کرلیا جس کا نام طالوت (Saul) تھا۔ طالوت کے بعد داؤدؑ بادشاہ ہوئے اور ان کے بعد سلیمانؑ۔ سلیمانؑ کے عہد میں انکی سلطنت بہت مالدار تھی اور انھیں کے زمانہ میں ہیکل یروشلم تعمیر کی گئی۔ سلیمان کی وفات کے بعد سلطنت دو حصوں میں منقسم ہوگئی، جنوب میں یہودا (Judah) کی اور شمال میں اسرائیل کی ان میں باہم سخت لڑائیاں ہوئیں یہاں تک کہ ۵۸۶ سال قبل مسیح یہودا کی اور ۷۲۱ سال قبل مسیح بنی اسرائیل کی سلطنت ختم ہوگئی اور اہل بابل یہودیوں کو غلاموں کی حیثیت سے گرفتار کرکے اپنے ملک لیگئے طویل زمانہ کے بعد یہ پھر واپس آئے اور حکومتِ شام کے تحت زندگی بسر کرنے لگے۔ شام میں اسوقت سلیوکس کی اولاد حکمراں تھی (یہ سکندر اعظم کا مشہور جنرل تھا)

بعد کو مکابیوس کی اولاد نے آزادی حاصل کرکے اپنے آپ کو حکمراں بنالیا۔ ۶۳ سال قبل مسیح یہودی رومہ کی

حکومت کے متعلق ہو گئے، چنانچہ ولادت مسیح کے وقت جو سب سے بڑے یہودی تھے یہ تمام علاقہ رومہ کی سلطنت میں شامل تھا۔

سنہ ۷۰ء میں شہنشاہ طیطوس نے ان کے معبد کو تباہ کیا اور ملک سے باہر کر دیا۔ اسی وقت یہودی چاروں طرف منتشر ہو گئے اور تقریباً ہر جگہ ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا۔ انگلستان سے یہ بارھویں صدی میں نکالے گئے لیکن سترھویں صدی میں پھر واپس آنے کی اجازت دیدی گئی۔ اُنیسویں صدی میں ان کو برابر کے شہری حقوق بھی مل گئے (اس سے قبل نہ ان کو ملازمت ملتی تھی اور نہ مساویانہ حقوق دوسری آبادی کے مقابلہ میں ان کو حاصل تھے)

سنہ ۱۹۳۳ء میں سامی النسل لوگوں کے خلاف ایک عام تحریک جرمنی میں شروع ہوئی اور اس کا سبب ہٹلر نے یہ بتایا کہ ملک کی تجارت پر یہ پوری طرح قابض تھے اور اہل ملک کے حقوق تلف ہو رہے تھے، تجارت اور لین دین میں ان کی مہارت ہمیشہ سے ضرب المثل رہی ہے اور اس باب میں ان کی سنگدلی کے واقعات بہت مشہور ہیں، چنانچہ شائی لاک کے افسانہ سے تقریباً ہر شخص واقف ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ان میں بعض بڑے بڑے اہلِ کمال بھی پیدا ہوئے، مثلاً برگساں۔ ڈسرائیلی۔ آئنسٹین۔ ہین اور اسپینوزا وغیرہ۔

اُنیسویں صدی میں ایک جدید تحریک یہ پیدا ہوئی کہ یہودیوں کو اپنے اصلی وطن فلسطین میں بسنا چاہئے، اس تحریک کا نام (Zionism) ہے جسے عربی میں صیہونیت کہتے ہیں۔ زیون یا صیہون اصل میں اس پہاڑی کا نام ہے جو یروشلم میں پائی جاتی ہے اور اسی لئے مجازاً یہودیوں کو اہل صیہون کہتے ہیں۔ جب جنگِ عظیم کے بعد فلسطین ترکوں کے قبضہ سے نکل گیا تو یہ تحریک اور زیادہ قوی ہو گئی۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں (Balfour Declaration) کے ذریعہ سے برطانیہ نے وعدہ کر لیا کہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا جائے گا سنہ ۲۱ء میں اس مقصد کے لئے مستقل فنڈ قایم کیا گیا اور یہودیوں کی آمد فلسطین میں شروع ہو گئی۔ اس وقت دنیا میں ایک کروڑ پچاس لاکھ خالص یہودی پائے جاتے ہیں، لیکن یہودی خون اس سے بہت زیادہ لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ میں تقریباً تین لاکھ یہودی آباد ہیں، لیکن ان میں وہ لوگ شامل ہیں جنھوں نے برائے نام عیسوی مذہب اختیار کر لیا ہے۔ یہ زیادہ تر شہروں ہی میں پائے جاتے ہیں اور بڑے وسیع پیمانہ پر مختلف قسم کے کاروبار کرتے ہیں۔ دولت کے لحاظ سے کوئی قوم ان کی ہمسر نہیں اور یہی وجہ انکے ساتھ رعایت کی ہے ان کا مذہب یکسر رسم و رواج ہے اور حلال حرام کے جھگڑے ان کے یہاں بہت پائے جاتے ہیں، مسلمانوں نے بہت سی باتیں انھیں سے لی ہیں۔ ان کی تقویم بھی علٰحدہ ہے، ان کا سال اکتوبر سے شروع ہوتا ہے اور اسوقت ان کا سنہ ۵۶۹۸ ہے۔ ان کی لٹریری زبان عبرانی ہے اور بڑا وسیع لٹریچر اس زبان میں پایا جاتا ہے۔ جس زبان میں گفتگو کرتے ہیں اس کا نام یدیش ہے جس میں متعدد اخبارات شایع ہوتے ہیں۔

راز و نیاز

(ایک شاعر اپنے حقیقی ماحول میں)

جب غمِ بے انتہا سے دل مرا گھبرا گیا — کسبِ فرحت کے لئے میں جانبِ دریا گیا
وقتِ شب تھا، خامشی کا دلنشیں ہنگام تھا — کارواں در کارواں طاری سکوتِ عام تھا
مل گئی تھی شورشِ عالم کو ہر غم سے نجات — ایک نقطہ پر سمٹ کر آگئی تھی کائنات
چودھویں کے چاند کی رعنائیاں تھیں بے نقاب — کر رہی تھیں وسعتِ عالم میں تقسیم شباب
ساحلِ دریا تک آکر رک گئے میرے قدم — فطرتِ بیدار تھی آمادۂ لطف و کرم
دیکھ کر آبِ رواں کو نغمہ ریز و نغمہ بار — ہوگیا حاصل مری آشفتہ حالی کو قرار
چاند کی سیمیں شعاعیں چھا رہی تھیں ہر طرف — مستیاں ہی مستیاں برسا رہی تھیں ہر طرف
منچلی ہر موج سے تھیں آئینہ سامانیاں — بڑھتی جاتی تھیں نگاہِ شوق کی حیرانیاں
ریت کے ذرّے چمکتے تھے ثریا کی طرح — تھا یہاں سب کچھ مرے خوابِ تمنا کی طرح
اسقدر پرکیف منظر بیشتر دیکھا نہ تھا، — دل جلے تسکین پاسکتے ہیں، میں سمجھا نہ تھا
کثرتِ جلوہ سے حاصل دل کو سرشاری ہوئی — رفتہ رفتہ روح پر اک محویت طاری ہوئی
سازِ دل آخر شعاعِ ماہ سے مل ہی گیا — میری اُمیدوں کا پژمردہ کنول کھل ہی گیا
کردیا جذباتِ وارفتہ نے فطرت سے قریب — ہوگیا دل میرا انوارِ حقیقت سے قریب
نطق پیرائی عطا کی جذبۂ خاموش نے — کردیا گویا مجھے کیفیتِ پرجوش نے
موجِ دریا سے رہا تا دیر سرگرمِ کلام — کرلیا معلوم میں نے رازِ تسکینِ دوام
چاند اور تاروں سے کی میں نے مسلسل گفتگو — ہوگئی حاصل مجھے معراجِ کیفِ آرزو
رات بھر میخانۂ فطرت کی مے پیتا رہا — چاند کی کرنوں سے اپنے زخمِ دل سیتا رہا
چن لئے میں نے نئے جلوے حریمِ ناز سے — ذہن نے بیداریاں پائیں، نئے انداز سے
بارشِ الہام سے ذہنِ رسا تاباں ہوا — از سرِ نو زندگیِ عشق کا ساماں ہوا
الغرض جاری رہا تا صبح یہ راز و نیاز — ہوگئی آغوشِ فطرت میں محبت کی نماز

صبح کی آمد حیاتِ نو کا اک عنوان ہوئی
قسمت تاریک جاگی اور نور افشاں ہوئی

نبی احمد بریلوی

کسی کی تصویر سے

یہ کس کی شبیہ دلکش ہے - ہاں، یہ تو تمھاری صورت ہے!
یہ رنگ چڑھایا ہے کس نے - یہ کس کا خونِ محبت ہے!
یہ ہار پنھایا ہے کس نے - شاید یہ کسی کی حسرت ہے!
پاکیزہ نگاہیں کیا کہنا - معصوم تبسم کیا کہنا!
ان پیارے پیارے ہونٹوں پر خاموش ترنم کیا کہنا!
الفاظِ خموشی میں بھی نیا اندازِ تکلم کیا کہنا!

تم شمع سے بڑھ کر روشن ہو - جلتے ہوئے پروانوں کی قسم!
صہبا سے زیادہ رنگیں ہو - چلتے ہوئے پیمانوں کی قسم!
پھولوں سے زیادہ دلکش ہو - فطرت کے گلستانوں کی قسم!
لو آؤ کہ اب میں تم سے کچھ اظہارِ حقیقت کرتا ہوں
یعنی کہ لبِ خاموش کو اب رسوائے شکایت کرتا ہوں
کچھ سہمے سہمے لفظوں میں تشریح محبت کرتا ہوں!!

ہم دونوں محبت کی بستی بچپن میں بسایا کرتے تھے
مٹی کے گھروندے دریا کے گھاٹوں میں بنایا کرتے تھے
ہم تم سے لڑکپن میں اکثر شادی بھی رچایا کرتے تھے!!
معصوم محبت سے ہم کو کچھ اُنس سا ہوتا جاتا تھا،
دل میٹھے میٹھے خوابوں میں راتوں کو کھوتا جاتا تھا،
تھی کچھ نہ خبر اور بیج کوئی الفت کے بوتا جاتا تھا!!

اچھا ہے میں تم سے مل نہ سکوں اچھا ہے کہ مجھ سے دور رہو
میں ملنے سے مجبور رہوں - تم ملنے سے مجبور رہو
تم دور رہو - یا پاس رہو آباد رہو مسرور رہو

سلام مچھلی شہری

وجدانیات وجد

(سکندر علی وجد)

آنکھوں سے عیاں ہے تری لے جانِ تمنا — چھپتا ہے کہیں خونِ شہیدانِ تمنا
اُلفت میں شکستوں پہ شکستیں ہوئیں لیکن — چھوٹا نہ کبھی ہاتھ سے دامانِ تمنا
اے یاس یہ شعلہ نفسی چھوڑ خدا را! — برباد نہ ہو جائے گلستانِ تمنا
آسائشِ دائم مجھے درکار ہے یارب! — بجھتی بھی نہیں شمعِ شبستانِ تمنا

ہے وجد عبث دعوۂ اخفائے محبت
آنکھوں میں سماتا نہیں طوفانِ تمنا

فیضِ اثر سے عشق کے دل کا عجیب رنگ ہے — دولتِ حُسن کے لئے سارے جہاں سے جنگ ہے
قوتِ سیل سے نہ ڈر، موج سے کھیل بے خطر — ساحلِ پُرسکوں مگر، تیرے لئے نہنگ ہے
موت ہے ایسی زندگی جس میں خلش نہیں کوئی، — کوئے جفاکشی میں جی، عرصۂ عیش تنگ ہے
خشم عدو ہے دلنواز، طرزِ ستم ہے مثلِ ناز — ہاں نگہِ زمانہ ساز میرے لئے خدنگ ہے!
دولتِ صبح و شام لے، وقت کی باگ تھام لے — دستِ جنوں سے کام لے، پائے خرد میں لنگ ہے

وجد یہ اہلِ گلستاں، آج یہ راز ہے عیاں
عشق سحابِ درفشاں، حسن سرابِ رنگ ہے

افکار کاوش

(کاوش حیدرآبادی)

کاٹی تمام عمر غمِ زندگی کے ساتھ — اپنی تو دو گھڑی بھی نہ گزری خوشی کے ساتھ
ڈرتا ہوں وضع کی ہو نہ کوئی نئی جفا — تم اور یہ التفات میری بیکسی کے ساتھ!
ساقی! تری نگاہ کے صدقے پلائے جا — وابستہ زندگی ہے اسی بیخودی کے ساتھ
اُن کی نگاہِ ناز نے لے لی متاعِ ہوش، — اپنی خوشی بھی ہوگئی اُن کی خوشی کے ساتھ
آنکھوں میں انتظار کا عالم لئے ہوئے — دنیا سے جا رہا ہوں میں کس بیکسی کے ساتھ
کاوش! کمالِ ضبط کا انجام کچھ نہ پوچھ — کیا جانے کتنے اشک ہیں میری ہنسی کے ساتھ

جذباتِ کیف

(کیفی چریاکوٹی)

جہاں اک اک قدم پر ہے متاعِ زندگی اپنی
کوئی کہدے، کہ اُس کوچے سے ہم کیونکر گزر جائیں؟

کوئی مستوں سے آکر سیکھ لے آدابِ میخانہ
کہ بیخود ہو کے نکلیں اور سب سے بیخبر جائیں

لبوں پر، دم رُکا ہے رہ گرائے بزمِ امکاں کا
تمہارا حکم کیا ہے اب؟ بڑھیں ہم یا ٹھہر جائیں

ہوائے تندِ آزادی میں جانِ مضطرب گم ہے
نشیمن کی طرف جائیں تو میرے بال و پر جائیں

جسے منزل سمجھ کر چل پڑے تھے، وہ نہیں ملتی
اگر جائیں تو ہم اب کس طرف اے ہمسفر جائیں

لطافت، طرزِ خودبینی میں پیدا ہو نہیں سکتی
اڑے رُخ سے جو رنگِ زندگانی، ہم نکھر جائیں

گریباں گیر ایماں، کفر ہے دامن کشاں کیفی،
نگاہِ مست جس پر ڈال دیں وہ، ہم اُدھر جائیں

عذاب

(کاوش)

رات کی بزم ہے سکوت فروش
کروٹیں لے رہی ہے روحِ سروش

رقص تاروں میں ہے بحدِ جمال
حسن اور عشق میں ہے قیل و قال

ذوقِ سرمایہ دار ہے مسرور
گنگناتا ہے جذبۂ مغرور

ہنس رہے ہیں ایاغِ عشرت رنگ
رو رہی ہے نگاہِ عسرت رنگ

سو رہا ہے سڑک پہ اک مزدور
گرسنہ، مضمحل، صبور و شکور

کیا بھیانک ہے منظرِ خوں ریز،
آج بھی ہیں زمانہ میں چنگیز

ایک پستی میں اک بہ اوجِ کمال
گل ہے شمعِ دماغِ فکر و خیال

خون روائے نگاہِ شعرِ حیات
جگمگا اے رہِ خرامِ نجات

یہ ہمارے خدا کا ہے انصاف
فاقہ کش! جاگ!! یہ ہے وقتِ مصاف

ٹوٹ اے برقِ انقلاب خراب
اب تو دیکھا نہ جائے گا یہ عذاب

حضور!

فقیہِ شہر کا تکرار و بحث شغل ہوا
تہی خمی سے ہے اب صوفیا کے دل کا سرور

گریز راہبِ بے چارہ کو جہان سے ہے
کلیم چھوڑ چکا آرزوئے جلوۂ طور

ازل کا نور ہے زیرِ نقابِ خاک ابھی
تلاش کر نہ سکا اس کو فلسفی کا شعور

ہے شاعروں کے خموں میں فقط شرابِ دروغ
غزل سرا ہے، سو اپنی نوا سے بھی ہے نفور

حرم کے شیخ کو اپنا پتا بھی مل نہ سکا
عجم کے دیر نشیں کعبۂ جمال سے دور

کوئی سبو نہ کسی ہاتھ میں نظر آیا
کہ جس میں سوزِ محبت کی ہو شرابِ طہور

کسی کی آنکھ میں ایسی نظر نہیں باقی!
اثر سے جس کے ترے غیب میں عیاں ہو "حضور"

نعیم صدیقی

آیندہ جنوری سنہ ۳۹ء کا نگار

یعنی مصحفی نمبر طیار ہے

اور اپنی جامعیت کے لحاظ سے اُردو شاعری کی تاریخ میں بالکل پہلی چیز ہے ـ مصحفی کا مرتبہ اسوقت تک لوگوں نے نہیں پہچانا اور اب بالکل پہلی مرتبہ آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ کیسی غیر معمولی ہستی تھا۔ مصحفی کے غیر مطبوعہ دواوین اور غیر مطبوعہ مثنویوں کا انتخاب ـ مصحفی کی غزلیات پر بالکل جدید اُصول انتقاد کے لحاظ سے تفصیلی تبصرہ ـ مصحفی کے شاگردوں کے متعلق ایک عالمانہ ریسرچ ـ مصحفی کے تذکروں اور دیگر تصانیف پر ایک فاضلانہ انتقاد ـ اور اسی طرح کے بہت سے عنوانات پر بے مثل مضامین آپ کو اس نمبر میں نظر آئیں گے ضخامت کا اندازہ ۲۰۰ صفحات کیا گیا ہے لیکن ممکن ہے اس سے بڑھ جائے غیر خریداران نگار کے لئے اس نمبر کی قیمت دو روپیہ مقرر ہے ـ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو خریداری کے سلسلہ کو جاری رکھئے تاکہ یہ نمبر آپ کو مل سکے ـ

مینیجر نگار لکھنؤ

وضعداری و بیدار مغزی

اس کی وضع داری اور پختگیِ انتظام کی دوسری مثال یہ ہے کہ ایک بار گرمی کے موسم میں شیخ عبد الغنی جونپوری بادشاہ سے ملنے آئے۔ ان کے لئے جو کھانا آیا اس میں موسم گرما کی وجہ سے شربت کے ۶ شیشے بھی موجود تھے۔ اس کے بعد اتفاق سے شیخ صاحب جاڑوں میں آئے، لیکن شربت کے قرابے اب بھی پیش کئے گئے ایک بار وہ جس طرح ایک آدمی سے ملتا پھر عمر گزر جاتی اسی طرح پیش آتا اور اس میں سر مو تفاوت نہ ہوتا

اس کی عدالت و بیدار مغزی کا یہ عالم تھا کہ ہر متدین شخص سلطنت کا اپنی جگہ پر مطمئن اور ہر خاین شخص ہر وقت لرزاں رہتا تھا اس طرح اس کی دیانت و بیر حسیتی کی یہ کیفیت تھی کہ اگر دنیا کی ساری دولت اسکے سامنے رکھدی جاتی تو وہ خلافِ احکام مذہب اس پر نگاہ نہ کرتا۔

لشکر کا معمول

جب لشکر کو وہ کسی مہم پر روانہ کرتا تو روزانہ دو فرمان عسکر کے نام پہونچتے۔ ایک نماز صبح کے وقت جس میں اور ہدایتیں درج ہوتیں سرایوں میں گھوڑوں کی ڈاک ہر وقت طیار رہتی۔ اگر لشکر ۵۰۰ کوس پر بھی ہوتا تو بھی اس معمول میں فرق نہ آتا۔

ارزانی کا خیال

روز اس کے سامنے کل اشیاء کا نرخ نامہ اور سلطنت کے تمام حالات و واقعات کی رپورٹ پیش ہوتی اور وہ فوراً تحقیقات کا حکم دیتا اگر کوئی نامناسب بات اُسے نظر آتی۔ یہی انتظام تھا کہ اس کے عہد میں غلہ اور تمام زندگی کی ضروری چیزیں بہت ارزاں تھیں اور قلیل آمدنی رکھنے والا بھی فراغت سے زندگی بسر کرتا تھا۔

قضاۃ و علماء کا تقرر

اس نے ایک قاضی کے علاوہ بارہ علماء بھی عرفِ مقدمات فیصلہ کرنے کے لئے مقرر کئے تھے اور جاسوس متعین تھے، جو عدالت کی تمام خبریں روزانہ بادشاہ تک پہونچاتے تھے۔ دریا خاں وکیل کو حکم دیا تھا کہ عدالت کے اندر پہر رات گئے تک بیٹھا رہے، کیونکہ ممکن ہے اس وقت کوئی مستغیث آجائے علاوہ اس کے وہ بعض اہم مقدمات کی خود تحقیقات کرتا اور سلطنت کے انتظام پر آپ توجہ کر کے آئین مقرر کرتا اور رعایا کے امن و سکون کی تدابیر ہر وقت سوچتا رہتا

مخبر و جاسوس

اس غرض کے لئے اس نے کثرت سے مخبر و جاسوس مقرر کر رکھے تھے جو رعایا و حکام کے تمام حالات اس تک پہونچاتے تھے اور یہ انتظام اس قدر مکمل تھا کہ بسا اوقات لوگوں کی وہ باتیں جو انتہائی خلوت سے متعلق ہوتیں اس کو معلوم ہوجاتیں۔ چنانچہ عام طور سے لوگوں کا خیال تھا کہ سلطان کے قابو میں کوئی جن ہے جو تمام باتوں سے آگاہ کر دیتا ہے۔[1]

---

[1] طبقات اکبری - ۱۷۱ -

وہ انصاف کرنے میں حد درجہ کاوش کرتا اور خاص فراست و دانائی سے کام لیکر حقیقت تک پہونچتا۔ چنانچہ صاحب طبقات اکبری نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ:۔

گوالیار کے دو غریب آدمی جو بھائی بھائی تھے مفلسی سے تنگ آکر فوج میں شامل ہو گئے۔ ایک لڑائی میں انھیں غارت کے سلسلہ میں دو لعل بھی مل گئے۔ ایک اس دولت پر قانع ہو کر واپس جانا چاہتا تھا اور دوسرا اس کے بعد بھی قسمت آزمائی پر مُصر تھا۔ جب ایک بھائی گھر جانے لگا تو دوسرے بھائی نے لعل سپرد کر کے کہا کہ میری بیوی کو دیدینا۔ جب یہ گوالیار واپس آیا تو اس نے اور چیزیں تو دیدیں لیکن لعل نہ دیا۔ جب مالک واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی سے استفسار کیا۔ اس نے انکار کیا۔ الغرض یہ معاملہ میاں بھورا[1] تک پہونچا جو دربار سکندر لودی کے امراء کبار میں سے تھے اور وہاں کے میر عدل بھی تھے انھوں نے گواہ طلب کئے۔ خائن بھائی نے ایک قمار خانہ سے دو جھوٹے گواہ پیش کر دئے، اور میاں بھورا نے ان گواہوں پر اعتبار کر کے فیصلہ کر دیا کہ "لعل بیوی سے وصول کر لینا چاہئے"۔ یہ غریب بہت پریشان ہوئی اور سیدھی آگرہ جاکر بادشاہ کی خدمت میں پہونچی۔ بادشاہ نے فریقین اور گواہوں کو طلب کیا۔ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی۔ بادشاہ کو یقین تھا کہ لعل اُس عورت کو نہیں دیا گیا۔ لیکن گواہوں کی موجودگی میں وہ کوئی خلاف حکم نہ دے سکتا تھا آخرکار اس نے سوچ کر گواہوں سے پوچھا کہ جب تمھارے سامنے اس عورت کو لعل دیا گیا ہے تو تم نے اسے ضرور دیکھا ہو گا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ہم نے دیکھا تھا۔ یہ سنکر بادشاہ نے موم کا ایک ٹکڑا ان دونوں کو دیا اور کہا کہ جاؤ الگ الگ اس لعل کی صورت و مقدار موم کے ذریعہ سے ظاہر کرو۔ جب یہ دونوں بنا کر لائے تو ایک کا بنایا ہوا نمونہ دوسرے کے نمونہ سے بالکل مختلف تھا اور لعل کی ہیئت و صورت سے کوئی مناسبت نہ تھی بادشاہ نے گواہوں کو دھمکایا اور انھوں نے سارا حال بیان کر دیا جس سے حقیقت واضح ہو گئی[2]"

انصاف کے باب میں وہ ضعیف اور قوی کو بالکل برابر سمجھتا اور کسی کی رعایت نہ کرتا۔ ایک بار کسی سید نے شکایت پیش کی کہ میاں ملک جاگیردار نے اس کی زمین چھین لی ہے۔ بادشاہ نے میاں بھورہ کو تحقیقات کا حکم دیا۔ لیکن اس مسئلہ میں کچھ ایسے نزاعات پیش آگئے کہ دو ماہ تک فیصلہ نہ ہو سکا۔ بادشاہ نے میاں بھورہ کو بلا کر کہا کہ کیوں ابتک فیصلہ نہیں ہو سکا۔ آج اُس وقت تک عدالت گاہ سے کوئی نہ جائے جب تک یہ معاملہ طے نہ ہو جائے۔ چنانچہ تمام علما تین پہر رات گئے تک بیٹھے رہے اور اسی وقت بادشاہ کو نتیجہ سے اطلاع دی گئی جو مستغیث سید کے حق میں تھا۔ بادشاہ نے میاں ملک جاگیر کو بلا کر دریافت کیا کہ کیوں تم نے میرے خلاف حکم ظلم کیا اور وظائف و املاک کی زمین تم نے کیوں چھینی۔

---

[1] اس نام میں اختلاف ہے بعض مورخین نے بھوَوہ اور بعض نے بھورا لکھا ہے۔ [2] طبقات اکبری۔ ۱۷۲۔ فرشتہ ۱۸۹۔

میاں ملک نے منفعل ہو کر اعتراف جرم کیا۔ بادشاہ نے اس سے تین بار سب کے سامنے اعتراف جرم کرا کے نادم کیا اور پھر کبھی اس کو کوئی جاگیر نہ دی[1]

وہ فطرتاً بے انتہا سیر چشم واقع ہوا تھا۔ ایک بار سنبھل کے ضلع میں کسی شخص کو زمین سے ۵۰۰۰ اشرفیوں کا دفینہ مل گیا۔ لیکن میاں قاسم حاکم سنبھل نے اس سے لے لیا۔ اس نے بادشاہ کی خدمت میں درخواست روانہ کی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ فوراً دفینہ پانے والے کو واپس دیا جائے۔

حاکم سنبھل نے عرضداشت روانہ کی کہ اتنی بڑی رقم پانے کا یہ شخص مستحق نہیں ہے۔

بادشاہ نے ایک فرمان اس کے پاس بھیجا کہ "اے بیوقوف جس نے اس کو یہ دفینہ عطا کیا ہے وہ بہتر جاننے والا ہے اگر یہ شخص مستحق نہ ہوتا تو وہ کیوں دیتا۔ ہم لوگ سب خدا کے بندے ہیں اور وہی بہتر جانتا ہے کہ ہم میں سے کون کس چیز کا مستحق ہے۔"

اسی طرح ایک بار اجودھن میں ایک درویش شیخ محمد کے کھیت میں بہت بڑا دفینہ برآمد ہوا اس میں کچھ طلائی برتن ایسے بھی تھے جن پر سکندر کی مہر ثبت تھی۔ علی خاں حاکم لاہور و دیبل پور نے شیخ کو لکھا کہ یہ دفینہ میرے حدود حکومت کے اندر سے برآمد ہوا ہے اس لئے میرے پاس بھیجدو۔ شیخ نے انکار کیا اس پر علی خاں نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ:۔

"اجودھن میں شیخ محمد کو شاہی خزانہ دستیاب ہوا ہے۔"

بادشاہ نے اس کے جواب میں صرف یہ لکھدیا کہ:۔

"تم کو اس سے کیا واسطہ ہے اور تم کیوں شیخ محمد کے حالات سے اعتنا کرتے ہو"

اس کے بعد شیخ محمد نے کچھ طلائی برتن بادشاہ کی خدمت میں روانہ کئے۔ لیکن اس نے واپس کر دئے اور کہا کہ:۔

"تمھیں رکھو، ہمیں تمھیں سب کو خدا کے سامنے اپنے اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہے"[2]

یہ واقعہ تاریخ سلاطین افاغنہ اور واقعات مشتاقی[3] میں بھی درج ہے۔

اگر وہ کسی کو جاگیر عطا کر دیتا اور پھر کسی سبب سے اس کی آمدنی بڑھ جاتی تو مطلقاً پرواہ نہ کرتا۔

---

[1] تاریخ داؤدی (ایلیٹ) ۴۔ ۴۵۴ — [2] تاریخ داؤدی (ایلیٹ) ۴۔ ۴۵۲ ۔ ۴۵۳ ۔

[3] واقعات مشتاقی کا مصنف شیخ رزق اللہ مشتاقی تھا۔ یہ ۸۹۷ھ میں پیدا ہوا اور ۹۸۹ھ میں اس کا انتقال ہوا مخزن افغانی میں اس کو صرف مولانا مشتاقی لکھا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۲ پر ملاحظہ ہو)

ایک بار اس نے ملک بدرالدین کا وظیفہ سات لاکھ تنکہ مقرر کرکے ایک پرگنہ تفویض کر دیا۔ پہلے ہی سال اسکی آمدنی ۹ لاکھ تنکہ ہوگئی اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ "زاید دو لاکھ کی بابت کیا حکم ہوتا ہے" بادشاہ نے کہا کہ:- "تم رکھ لو"۔ دوسرے سال گیارہ[۱۱] لاکھ آمدنی ہوئی اور بادشاہ نے پھر یہی حکم دیا۔ تیسرے سال آمدنی پندرہ[۱۵] لاکھ ہوگئی اس نے پھر عرض کیا۔ بادشاہ نے کہا۔ "جاگیر تمھاری ہے اس لئے اس کی آمدنی بھی صرف تمھاری ہی ہوسکتی ہے مجھ سے کیوں بار بار ذکر کرتے ہو؟"[۱]

چونکہ خود بادشاہ کی نیت ایسی اچھی تھی اس لئے تمام امرار و جاگیردار بھی ایسے ہی دیانت دار و امین تھے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۱)

اس کے باپ کا نام شیخ سعد اللہ تھا۔ مولانا مشتاقی کو کمسنی سے علماء کی صحبت کا بہت شوق تھا اور اس طرح اس نے بہت فایدہ اٹھایا۔ جو کچھ واقعات و حالات گزشتہ زمانہ کے اس کو علماء و مشائخ کے ذریعہ سے معلوم ہوتے تھے وہ لوگوں کے سامنے بیان کرتا تھا۔ آخر کار اس کے احباب نے مجبور کیا کہ وہ ان تمام حالات کو قلمبند کرے چنانچہ اس نے اپنے تمام تاریخی معلومات و تحقیقات کو یکجا فراہم کر دیا اور اس کا نام واقعات مشتاقی رکھا۔

مولانا عبدالحق نے اپنے تاریخ حقی اور شیخ نورالحق (عبدالحق کے بیٹے) نے اپنی زبدۃ التواریخ میں مولانا مشتاقی کی نسبت لکھا ہے کہ وہ بہت بڑے سیاح تھے انھوں نے اپنے عصر کے بڑے بڑے علماء، مشائخ اور صاحبان فضل و کمال کی صحبت سے فایدہ اٹھایا وہ خود بھی بڑے فاضل شخص تھے اور علم تصوف سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ فارسی میں ان کا تخلص مشتاق اور ہندی میں راجن تھا ہندی زبان کے بہت بڑے ماہر تھے۔ ان کی تصنیف "پیابن جوب ترنجن" اور دیگر رسایل ہندی زبان میں بہت مشہور ہیں۔

مولانا مشتاقی کے آٹھ بھائی تھے جو سب کے سب قابل تھے۔ ان کا دادا شیخ فیروز علاوہ صاحب سیف ہونے کے مشہور اہل قلم بھی تھا۔ اس نے سلطان بہلول اور سلطان حسین شرقی کی باہمی جنگ کا حال ایک طویل نظم میں تحریر کیا تھا جو مولانا عبدالحق کے پاس تھی لیکن بعد کو گم ہوگئی۔ شیخ فیروز کا انتقال ۸۶۰ھ میں ہوا۔

واقعات مشتاقی میں سلطان بہلول لودہی سے ابتدا کی گئی ہے اور سلسلہ وار عہد اکبری کے حالات لکھ کر شیر شاہ اسلام شاہ سلطان محمود عدلی، غیاث الدین خلجی (مالوہ) اور سلطان مظفر شاہ (گجرات) کے حالات پر یہ کتاب ختم ہوجاتی ہے۔

یہ کتاب نایاب ہے اور صرف دو نسخے اس وقت اس کے موجود ہیں۔ ایک مسٹر لیٹ کے پاس تھا جس سے انھوں نے فایدہ اٹھایا، دوسرا لکھنؤ کے کتب خانہ موتی محل میں۔

[۱] تاریخ داؤدی (الیٹ) ۴ - ۴۷۵ -

جاگیر مقرر کرنے کے بعد وہ کبھی اس میں تغیر نہ کرتا لیکن اسوقت کہ اگر کسی جاگیر دار پر کوئی قصور ثابت ہو جائے تو اس صورت میں اسی کی جاگیر لے لیتا۔ لیکن اس کی توقیر و عزت میں کمی نہ کرتا۔

وہ حرص و طمع کے جذبات سے بالکل ناواقف تھا اور ہمیشہ ایسے جرموں میں جن کا تعلق سلطنت کی آمدنی سے ہوتا بہت نرمی سے کام لیتا۔ جشن عید اور ۱۲ ربیع الاول[۱] کو قیدیوں کی فہرست اس کے سامنے پیش کی جاتی اور بقایائے مالگذاری کے سبب سے جتنے لوگ قید ہوتے سب کو رہا کر دیتا۔

مذہب کی طرف بہت غلو تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی کام خلاف شریعت اس کی سلطنت میں نظر نہ آئے۔ چنانچہ اسنے اسی سلسلے میں حکم نافذ کر دیا کہ مزاروں پر عورتوں کا جانا اور سالانہ سالار مسعود کی چھڑیاں نکالنا ممنوع قرار دیا جائے مولانا مشتاقی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تعزیہ داری اور سیتلا کی پوجا کو بھی اس نے روک دیا تھا۔

اس نے کثرت سے مساجد تعمیر کرائیں اور ہر مسجد میں ایک واعظ ایک قاری اور ایک جاروب کش مقرر کیا جن کو ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ موسم سرما میں محتاجوں کو کثرت سے کپڑے اور شالیں تقسیم کی جاتیں اور ہر جمعہ کو ایک مقررہ رقم غربا کو تقسیم کی جاتی۔ رمضان اور ربیع الاول کے مہینوں میں مساکین و مستحقین کو بیدریغ روپیہ دیتا۔

اس نے حکم دے رکھا تھا کہ ہر ششماہی پر سلطنت کے تمام غربا و مساکین کی فہرست پیش کی جائے۔ جب یہ فہرست پیش ہوتی تو وہ اُن کو اس قدر روپیہ دیتا کہ ۶ ماہ کے لئے کافی ہو جاتا۔ علاوہ اس کے مختلف شہروں میں مد خیرات کے متعلق بہت سے مہتمم مقرر تھے جو غریبوں اور محتاجوں کا حال معلوم کرکے بادشاہ تک خبر پہونچاتے اور خزانہ شاہی سے روپیہ لیکر انھیں تقسیم کرتے[۲]۔

چونکہ بادشاہ کو اس طرف بہت توجہ تھی اس لئے تمام امراء، ارکین، خوانین و ملوک نے بھی غربا و مساکین کے وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ چنانچہ واقعات مشتاقی میں لکھا ہے کہ اس داد و دہش کا نتیجہ تھا کہ اگر کوئی فقیر مرجاتا تو اس کے پاس سے کافی دولت نکلتی جو اس کے اعزہ کو دیجاتی اور اگر کوئی عزیز نہ ہوتا تو پھر فقراء کو تقسیم کر دیجاتی۔

اس کے عہد میں زراعت کثرت سے ہوتی تھی۔ چیزیں بہت ارزاں تھیں تاجر خوش حال تھے اور تمام اہل پیشہ اپنے اپنے مشاغل میں نہایت اطمینان کے ساتھ مصروف نظر آتے تھے۔ سلطنت میں کہیں چوروں اور رہزنوں کا پتہ نہ تھا اور قافلے نہایت امن و سکون کے ساتھ رات دن سفر کیا کرتے تھے۔ سکندر شاہ کو مغربی مورخین نے عام طور سے حد درجہ متعصب ظاہر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مذہب اسلام کا پابند تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ ہندوؤں کی رواداری نہیں کرتا تھا بالکل غلط ہے۔ اس کا مقصود یہ تھا کہ جو عنداللہ حق ہے وہی کیا جائے۔ چنانچہ جس زمانہ میں

---

[۱] رسول اللہؐ کی تاریخ رحلت ـــــ [۲] تاریخ داؤدی (ایلیٹ) ۴ - ۴۴۶۔

وہ اپنے بھائی باربک شاہ سے لڑ رہا تھا ایک قلندر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے کہا کہ "فتح تیری ہے" بادشاہ نے جھنجھلا کر ہاتھ الگ کر لیا اور جواب دیا کہ "دعا یہ کرنی چاہئے کہ اللہ اُس کو فتح دے جو حق پر ہے اور وہی ظہور میں آئے جو بہتر و مناسب ہو"

رواداری

قبل تخت نشینی کے ایک بار سکندر کو معلوم ہوا کہ تھانیسر میں ایک گاؤں ہے۔ وہاں کے ایک تالاب میں ہندو جمع ہو کر اشنان کرتے ہیں اس نے علماء سے استصواب کیا۔ میاں عبداللہ اجودھنی نے جو بڑے جید عالم تھے کہا کہ

"ہندوؤں کے کسی قدیم معبد کو غارت کرنا یا اُن کی کسی مذہبی رسم سے تعرض کرنا مناسب نہیں ہے"

سکندر نے یہ سُن کر کچھ نہیں کہا اور اپنے خیال سے باز آ گیا۔[1]

علم دوستی

وہ ان تمام صفات کے ساتھ علم دوست بھی اس درجہ کا تھا کہ اس کے عہد میں آگرہ (جو اس کا دار الحکومت تھا) علماء و فضلاء، مشائخ و صوفیہ شعراء و ادباء کا مرکز ہو گیا تھا۔ فارس و عرب، ہند و بخارا کے تمام صاحبان کمال کھنچ کھنچ کر آگرہ چلے آرہے تھے اور بادشاہ کی فیاضیوں سے مالامال نظر آتے تھے۔

مذہبی مباحث

مذہبی مباحث کا اُسے بہت شوق تھا اور اکثر علماء کو جمع کرکے وہ ان کی گفتگو سنا کرتا تھا۔ ایک بار جب بودھن نامی ایک برہمن نے یہ دعوے کیا کہ تمام مذاہب برابر ہیں تو سکندر شاہ نے بہت سے مقتدر علماء[2] کو حکم دیا کہ وہ اس سے بحث کریں۔

ذوق شعر و شاعری

شعر و سخن کا بھی اُسے ذوق تھا گل رخ اس کا تخلص تھا کبھی کبھی شعر کہتا تھا[3] اور شیخ جمال کنبوہ سے جو بڑے پایہ کا شاعر تھا اصلاح لیا کرتا تھا۔[4]

---

[1] تاریخ فرشتہ، ۱۸۰ تاریخ داؤدی (الیٹ) ۴-۴۳۹ [2] ان علماء کی فہرست حسب روایت فرشتہ یہ تھی۔ میاں قادر بن شیخ خواجو۔ میاں عبداللہ۔ سید محمد بن سعید خاں دہلوی۔ ملا قطب الدین و ملا الہ داد صالح سرہندی۔ سید امان۔ سید برہان۔ سید احسن قنوجی۔ سید صدر الدین۔ میاں عبدالرحمن۔ میاں عبدالعزیز سنبھلی (فرشتہ ۱۸۲) [3] ملائے بدایونی نے یہ غزل اسکی منتخب التواریخ میں درج کی ہے۔

سروے کہ سمن پیرہن و گل بدنستش | روحے ست مجسم کہ دراں پیرہنستش
مشک ختن چیست کہ صد مملکت چین | در حلقہ آں زلف شکن در شکنستش
در سوزن مژگاں بکشم رشتۂ جاں را | تا چاک بدوزم کہ دراں پیرہنستش
گل رخ چہ کند جوہر دندان ترا وصف | ہمچوں در سیراب سخن در دہنستش

[4] عہد سکندر شاہ میں شیخ جمال بڑا مشہور شاعر تھا اور بادشاہ اس سے بہت مانوس تھا اور مشورہ بھی لیا کرتا تھا۔ شیخ جمال کا یہ ایک شعر فرشتہ اور ملائے بدایونی نے نقل کیا ہے ؎ مارا ز خاک کویت پیراہنے ست برتن | آنہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن

سیر العارفین اسی کی تصنیف ہے اور اس کا ایک دیوان بھی ۹ ہزار سے زائد اشعار کا تھا۔

دربار کے شعراء

اس کی صحبت میں علماء کے ساتھ شعراء بھی رہا کرتے تھے ان میں سے ایک ڈونگر برہمن بھی تھا جو عربی و فارسی کا عالم ہونے کے علاوہ شاعر بھی اچھا تھا۔

ملائے بدایونی، عہد سکندری کے بعض مقتدر علماء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ بڑے پایہ کے فاضل تھے۔ جب ملتان تباہ ہوا تو دہلی کی طرف آئے اور چالیس علماء (مثلاً جمال خاں دہلوی، شیخ لودی سید جلال الدین بدایونی وغیرہ) شیخ عبداللہ کی درسگاہ سے نکل کر اشاعت علوم کا باعث ہوئے۔ ہندوستان میں علوم معقولی کا رواج شیخ عبداللہ کے وقت سے ہوا ورنہ اس سے قبل علم منطق وکلام میں صرف شرح شمسیہ اور شرح صحایف پڑھائی جاتی تھیں۔

شیخ عبداللہ کا احترام

سکندر شاہ، مولانا شیخ عبداللہ[1] کا حد درجہ احترام کرتا تھا جب کبھی درس کے وقت پہونچتا تو پوشیدہ طور سے کسی کونہ میں جاکر بیٹھ جاتا۔ تاکہ درس و تدریس میں حرج واقع نہ ہو جب وہ فارغ ہو جاتے تو بادشاہ سلام علیک کہہ کر سامنے آجاتا۔

شیخ عزیز اللہ

شیخ عزیز اللہ کے استحضار علوم کا یہ حال تھا کہ مشکل سی مشکل کتاب زبانی پڑھاتے تھے، انھیں کے شاگردوں میں میاں قاسم سنبھلی تھے۔

شیخ الہدیہ

اسی عصر کے ایک اور زبردست عالم شیخ الہ دیا بھی تھے جنھوں نے ہدایہ کی شرح کئی جلد میں تحریر کی ہے علاوہ اس کے تفسیر مدارک پر ان کے حواشی اور شرح کافیہ کافی شہرت رکھتے ہیں اس زمانہ میں ان کی یہ تمام کتابیں درسیات میں داخل تھیں۔

امتحان

ایک بار سلطان سکندر نے تمام علماء کو جمع کر کے ایک جانب شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز کو، دوسری جانب شیخ الہ دیا اور ان کے بیٹے بھکاری کو کر کے مباحثہ سنا اور آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ وہ دونوں تقریر میں اور یہ دونوں تحریر میں اپنا جواب نہیں رکھتے[2]۔

ہندوؤں کی فارسی کی طرف توجہ

الغرض سکندر شاہ کے دربار میں ہر وقت علمی چرچے ہوا کرتا تھا اور یہ فخر اس بادشاہ کو حاصل ہے کہ اس کے عہد میں سب سے پہلے ہندوؤں نے فارسی کی طرف توجہ کی اور مسلمانوں سے علوم حاصل کرنے شروع کئے[3]۔

ہندو مسلمانوں کے تعلقات

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان کافی تعلقات قایم ہو گئے تھے اور وہ ایک دوسرے کی زبان کو نہایت شوق سے حاصل کرتے تھے۔ مسٹر بلاک مین کلکتہ ریویو[4] میں ظاہر کرتے ہیں کہ "ہندوؤں نے

---

[1] شیخ عبداللہ کا انتقال ۹۲۲ھ میں ہوا۔ [2] منتخب التواریخ - ۸۶۔

[3] Keen's Mediaval India, Cal: Review LXXIX P. 71 [4] Cal: Review CIV

سولھویں صدی عیسوی سے فارسی کی طرف ایسی توجہ کی کہ ایک صدی گزرنے سے قبل وہ اس زبان میں مسلمانوں کے برابر ہوگئے۔"

ہندو اور فارسی زبان

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں زیادہ اتحاد پیدا ہوگیا تھا اور دوسرے یہ کہ سکندر لودی نے قصداً ہندوؤں میں یہ مذاق پیدا کیا تاکہ انھیں سلطنت میں انتظامی عہدے دیے جائیں۔ چنانچہ جب فارسی خوان ہندوؤں کی ضرورت ہوئی تو اس نے پہلے برہمنوں سے درخواست کی کہ فارسی سیکھیں۔ انھوں نے انکار کیا تو چھتریوں سے کہا گیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم اہلِ سیف ہیں اہل قلم بننا پسند نہیں کرتے۔ اس کے بعد ویش طبقہ کو توجہ دلائی گئی لیکن اس نے تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے عذر کیا آخرکار کایستھوں نے اسے قبول کیا اور قلیل زمانہ میں ایسی دستگاہ حاصل کرلی کہ وہ مسلمانوں کے علوم کا درس دینے لگے اور سلطنت میں بڑے بڑے عہدے ان کو ملے۔

تصانیف

سلطان سکندر کے عہد میں تصانیف کثرت سے ہوئیں۔ جن میں خود بادشاہ اور اس کے امراء کا ذوق علمی بہت کچھ شامل تھا۔ تاریخ داؤدی میں لکھا ہے کہ ارکرمہاویدک، جو فن طب کے متعلق سنسکرت کی مشہور کتاب تھی۔ فارسی زبان میں طب سکندری کے نام سے ترجمہ کی گئی اور بعد کو اطبار ہند نے اس سے بہت فایدہ اٹھایا۔[1]

دیگر فنون اور ذوق موسیقی

بادشاہ کو دیگر فنون وصناعات کے علاوہ جن کے کارخانہ کثرت سے قایم تھے۔ موسیقی کا بھی بہت ذوق تھا وہ دربار عام میں تو کبھی گانا سننا پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن تنہائی میں اہل موسیقی کو اپنا کمال ظاہر کرنے کی اجازت دیتا اس وقت صرف سید روح اللہ اور سید ابن رسول جو مقربانِ خصوصی میں سے تھے، اس کے خیمہ کے قریب ہوتے اُسے سُرنا اور شہنائی کا بھی شوق تھا۔ جو دربار میں ۹ بجے شب تک بجائی جاتی تھی۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ صرف چار راگنیاں مالی گور، (غالباً مالکوس) کلیان۔ کانڑا اور حسینی بجائی جائیں۔[2]

---

[1] واقعات مشتاقی کا مصنف اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے کہ "میاں بودہ نے جو خواص خاں کے جانشین ہوئے تھے خراسان سے بہت سی کتابیں فراہم کیں اور تمام علماء ہند و ایران کو طلب کرکے طب سکندری کو مرتب کرایا تھا۔

میاں بودہ بڑا علم دوست امیر تھا۔ بڑے بڑے اہل کمال اس کے دربار میں موجود رہتے تھے اور یہ اُن سے مختلف فنون پر کتابیں تصنیف کرایا کرتا تھا

[2] یہ بیان تاریخ داؤدی کا ہے۔ واقعات مشتاقی میں ان چار راگنیوں کا نام گورا، کلیان، کانڑا، مقام حسینی تحریر کیا ہے۔ احمد یادگار (مصنف سلاطین افاغنہ) بیان کرتا ہے کہ بادشاہ کے چار غلام تھے جو موسیقی کے ماہر تھے ایک چنگ نہایت خوب بجاتا تھا دوسرا قانون، تیسرا طنبورہ کا ماہر تھا اور چوتھا بین کا۔ یہ غلام حسن صورت کے لحاظ سے بھی بے مثل تھے۔

عمارات کی طرف توجہ

عمارات کی طرف بھی اسے خاص توجہ تھی چنانچہ جب وہ مہم بلکھات سے کامیاب واپس آیا تو اس نے حکم دیا کہ دارالحکومت آگرہ سے لیکر دھولپور تک جابجا باغات اور مکانات تعمیر کرائے جائیں تاکہ شکار سے واپس آنے کے بعد یہاں توقف کیا جائے۔[1]

آگرہ کی ترقی

پھر علاوہ اس کے خود آگرہ کی رونق و ترقی، جس کو اس نے اک معمولی گاؤں سے بڑے شہر میں تبدیل کر دیا تھا، اسکے ذوقِ تعمیر، آرائشِ شہر و امورِ رفاہِ عام کا کافی ثبوت ہے۔

یہ خصوصیت بھی اسی بادشاہ کو حاصل ہوئی کہ اس کے عہد میں ایسے ایسے امراء گزرے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے خصایل و عادات اپنے اخلاق و شائستگی، اپنے علم پرستی و ہنر پروری کے لحاظ سے ایک مستقل تصنیف چاہتا ہے۔ چنانچہ تاریخ داؤدی اور واقعات مشتاقی میں بعض امراء کے مفصل حالات درج ہیں۔

مخصوص امراء

ان میں سے خاص امراء یہ تھے :- اسد خاں[2] ابن مبارک خاں یوسف خیل۔ خان جہاں لودی[3] جسے سند علی حسین خاں کہتے تھے۔ میاں زین الدین[4]۔ خواص خاں[5] اور میاں معروف[6] فرملی۔

ان کے حالات دیکھنے سے (جو مختصراً ہم نے فٹ نوٹ میں درج کر دئے ہیں) ایک شخص اچھی طرح معلوم کر سکتا ہے کہ سکندر لودی کا عہد کیسا عجیب و غریب عہد تھا اور امراء و ارکین سلطنت پر خود اس کی سیرۃ کا کیسا زبردست اثر پڑا تھا۔

---

[1] منتخب التواریخ - ۱۵ — [2] اسد خاں، مبارک خاں یوسف خیل کا بیٹا تھا اس کی دریا دلی اور فیاضی کی داستانیں مشہور ہیں تاریخ داؤدی کا مصنف بیان کرتا ہے کہ جب وہ کھانے کے لئے بیٹھتا تو ستر دقیمتی چینی کے قابوں میں ہر قسم کا کھانا الگ کیا جاتا اور ہر قاب پر ایک پان معہ ایک اشرفی کے رکھ کر سب غرباء کو تقسیم کر دیا جاتا۔ اس کے اخلاق کی یہ حالت تھی کہ اپنے خادم سے بھی وہ اسی طرح خطاب کرتا تھا جیسے اپنے کسی ہمسر سے۔

ایک بار اُسے معلوم ہوا کہ شیخ محمد فرملی آج کل عُسرت کی حالت میں ہے اور اس کی لڑکی کی شادی ہونے والی ہے۔ اسد خاں نے اُسے بلایا اور اپنے غلام کو حکم دیا کہ دونوں مٹھیوں میں اشرفیاں لیکر اس کے دامن میں ڈالدے جب اس کی تعمیل ہو چکی تو اسد خاں نے اشرفیوں کا شمار کرایا۔ معلوم ہوا کہ ستر ہزار تنکہ قیمت کی اشرفیاں ہیں۔ یہ دیکھ کر اسد خاں نے حکم دیا کہ ایک لاکھ تنکہ پورا کر دیا جائے ملا احمد یادگار نے اس واقعہ کو بھیکن خاں ہفت ہزاری سے منسوب کیا ہے جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے چالیس مساجد تعمیر کرائیں اور ہر مسجد میں ایک امام اور ایک واعظ مقرر کیا۔ یہ بھی بڑا دریا دل امیر تھا۔ روزانہ سوار ہو کر بازار میں نکلتا اور جب تک ۵۰۰ تنکہ غرباء کو تقسیم نہ کر دیتا گھر واپس نہ آتا۔

ایک بار شکار میں کسی دیہاتی نے دہی کسی برتن میں پیش کیا اسد خاں نے اس برتن کو اشرفیوں سے بھروا دیا۔ اسی طرح ایک بار گانوں کی کوئی عورت نیم کی پتیوں کی ترکاری بنا کر لائی۔ اسد خاں بہت خوش ہوا اور وہ ترکاری لیکر اسکے برتن میں بھی اشرفیاں چوٹی تک چنوا دیں۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۸ پر ملاحظہ ہو)

عہدِ سلطان سکندر کے خاص واقعات میں زلزلۂ آگرہ کا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ یہ زلزلہ ۹۱۱ھ (۳ ماہ صفر) کو تمام ہندوستان میں آیا تھا۔ یہ اس قدر شدت کے ساتھ محسوس ہوا کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ قیامت آگئی ہے۔ اس میں جان و مال کا سخت نقصان ہوا۔ تمام مورخین نے اس کا ذکر کیا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۷)

(احمد یادگار نے اس واقعہ کو بھی بھیکن خاں سے منسوب کیا ہے) ایک دن اسد خاں گھوڑوں کی خریداری کر رہا تھا اور صدر خاں کو (جو خود بھی امراء میں سے تھا اور اسد خاں کا مخلص دوست تھا) دکھاتا جاتا تھا۔ جب سودا ختم ہوا اور صدر خاں گھر پہونچا تو معلوم ہوا کہ ۱۰۰ گھوڑے جنکی تعریف صدر خاں نے کی تھی اس کے مکان پر موجود ہیں (احمد یادگار نے اس واقعہ کو دولت خاں لودہی سے اور مصنف واقعاتِ مشتاقی نے سید خاں سے منسوب کیا ہے)۔ اسی طرح ایک بار جواہرات کی خریداری میں مصروف تھا۔ سات لاکھ، پانچ لاکھ، تین لاکھ تنکہ کے تین الماس اس نے پسند کئے اتفاق سے ایک شخص وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے کہا کہ تم ان میں سے کسی الماس کو اپنے لئے پسند کرتے ہو؟ اس نے سب سے کم قیمت ہیرے کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن اسد خاں نے وہ تینوں الماس اس کو دیدئے (واقعات مشتاقی میں یہ واقعہ سید خاں کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور احمد یادگار دولت خاں لودہی سے متعلق کرتا ہے اور اس قدر اضافہ اور کرتا ہے کہ سلطان سے کسی نے شکایت کی کہ دولت خاں، خزانۂ شاہی کو نہایت بیدردی سے لٹا رہا ہے لیکن سلطان نے جواب دیا کہ "تمھیں مجھے مبارکباد دینی چاہئے کہ ایسے ایسے امراء میرے دربار میں ہیں"۔ اور دولت خاں کو طلب کرکے نگینہ اور چاندپور کے پرگنے جاگیر میں اضافہ کردئے)

ایک دفعہ سلطان سکندر لودہی نے اسد خاں کو کسی خاص خدمت پر مامور کیا۔ جب یہ چندیری پہونچا تو معلوم ہوا کہ جن جانوروں کی پیٹھ پر خزانہ لدا ہوا ہے وہ بہت مجروح ہوگئے ہیں۔ لوگوں نے تجویز پیش کی کہ سارا روپیہ فوج کو تقسیم کردیا جائے پھر بعد کو ان کی تنخواہ اور جاگیر سے وضع ہوکر خزانہ میں داخل ہوجائے گا۔ اسد خاں نے منظور کرلیا لیکن جب بعد کو اس کے سامنے حساب پیش کیا گیا تو اس نے کہا میں صراف نہیں ہوں کہ روپیہ دوں اور لوں یہ کہکر اس نے سارے کاغذات پھاڑ ڈالے اور سات لاکھ تنکہ جو فوج کو تقسیم کیا گیا تھا معاف کردیا۔

ےـه خان جہاں لودہی کا نام مسند علی حسین خاں تھا۔ اسکی جاگیر بہت بڑی تھی اور میر بخشی کے عہدہ پر ممتاز تھا۔ اس نے اپنی تمام عمر میں کبھی کسی سپاہی کی تنخواہ میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ جرمانہ کیا۔ جب کوئی ملازم مرتا تھا تو اس کی تنخواہ اس کے بیٹے کے نام منتقل ہوتی تھی۔ اگر بیٹا نہ ہوتا تو بھتیجے یا بھانجے کو دیجاتی اور اگر یہ بھی نہ ہوتے تو وہ ماں یا کسی اور عزیز کو۔ وہ درباداری کو پسند نہ کرتا تھا اور اگر کوئی خادم خلاف اوقات آتا تو اس سے کہتا کہ تم گھر جاؤ کیونکہ میں بھی گھر میں ہوں تمھارے اوپر تمھارے اہل و عیال کے بھی حقوق ہیں انھیں ادا کرو۔ سیرچشمی اور فیاضی بھی اس کی مشہور تھی۔ بندگی میاں ایک دن خلاف معمول ذرا سویرے پہونچے اور کھچڑی کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن جب وہاں سے واپس آئے تو خلعت اور گھوڑے کے علاوہ ایک گاؤں بھی جاگیر میں لیکر آئے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۹ پر ملاحظہ ہو)

احتساب نفس اور کفارہ گزشتہ

جب بادشاہ بیمار ہوا اور اس نے خیال کیا کہ شاید وہ زندہ نہ رہیگا تو اسنے اپنے مشیر مذہبی شیخ لاون دانشمند سے پوچھا کہ قضائے نماز۔ ترک صیام۔ شراب خوری وغیرہ کا کفارہ کیا ہو سکتا ہے۔ شیخ نے تفصیل لکھکر بھیجدی۔ سلطان نے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۸)

جب خان جہاں لودی کا انتقال ہوا تو سلطان سکندر لودھی نے تمام جاگیر مع عہدۂ میر بخشی کے میاں زین الدین کو عطا کردی جو خان جہاں لودہی کا نہایت معتمد علیہ افسر فوج تھا اور خان جہاں کے بیٹے احمد خاں کو ضلع کیتھل میں جاگیر دیکر تین لاکھ تنکہ نقد سالانہ مصارف ملبوس و سواری کے لئے مقرر کر دیا۔ کہ میاں زین الدین اپنے زہد و اتقار، فیاضی و اولوالعزمی کے لحاظ سے بے مثل شخص کے طلوع صبح صادق کے وقت بیدار ہوتے اور دوپہر تک عبادت و وظایف میں مشغول رہتے۔ لکھا جاتا ہے کہ روزانہ کم از کم دس منزل کلام مجید کی کھڑے ہو کر ختم کرتے۔

کھانے کے وقت علمار عصر دسترخوان پر ہوتے اور مسایل علمیہ پر اس وقت گفتگو ہوا کرتی۔ سہ پہر کو انتظامی معاملات کی طرف توجہ کرتے اور پھر نماز مغرب کے وقت سے عشار تک عبادت میں مشغول رہتے۔ اس کے بعد پھر کھانا کھاکر خلوت میں چلے جاتے۔ شب جمعہ میں وہ کوئی کام سوائے ذکر و شغل کے نہ کرتے۔ ایک شب سلطان سکندر لودہی نے تین آدمی ان کی طلب میں روانہ کئے لیکن یہ نہیں آئے اور سلطان نے بھی کچھ نہیں کہا کیونکہ شب جمعہ میں ان کا گھر سے باہر نکلنا یا کوئی دنیاوی کام کرنا خلاف معمول تھا۔

ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ اور دن میں تین بار تازہ کھانا تمام غربار کو (اور جو شخص آجائے) تقسیم کیا جاتا تھا رمضان بھر افطار و اسحار میں حکم تھا کہ جو شخص آجائے اُسے دودھ چاول کھانے کے لئے دیا جائے۔ ہر سال وہ اپنے تمام اعزہ کو دہلی سے آگرہ بلاتے اور وقت رخصت ہر شخص کی تمام ضروریات و خواہشات مہیا کرتے۔ ربیع الاول کی پہلے بارہ دنوں میں دو ہزار تنکہ روزانہ کا کھانا پکوا کر غربا کو تقسیم کرتے۔ اول و آخر دن چار ہزار تنکہ زائد کے خرچ سے حلوا وغیرہ بھی تیار کیا جاتا۔ سلطان سکندر لودہی کی وفات پر میاں زین الدین کی جاگیر وغیرہ سب لے لی گئی اور عسرت بہت بڑھ گئی لیکن اُن کی خوش نیتی اور سیر چشمی کا وہی عالم رہا اور باوجود عسرت و تنگدستی کے تین لاکھ تنکہ کی دستاویزیں چاک کر کے صرف اس لئے ضایع کرا دیں کہ کہیں عسرت کے زمانہ میں مدیون لوگوں سے وصولی روپیہ کا خیال نہ آجائے۔

؎ خواص خاں نہایت بہادر و ذی ہمت افسر تھا۔ سلطان سکندر لودی نے، نگرکوٹ کا کوہستانی علاقہ زیر کرنے کے لئے اسکو مامور کیا تھا اسنے بہت جلد یہ تمام صوبہ فتح کر کے دیبی شنکر کا مشہور مندر توڑا اور وہاں سے ہندؤں کا سنگ مقدس او رتانبہ کا چھتر لے آیا۔ پہلے اس نواح کی جاگیریں، صرف ۳ لاکھ تنکہ آمدنی رکھتی تھیں۔ لیکن اس فتح کے بعد ۱۵ لاکھ تک آمدنی بڑھگئی۔ جب یہ واپس آیا تو بیمار تھا۔ اس نے بادشاہ سے ملنے کی درخواست کی اور حاضر ہو کر تمام حسابات پیش کئے۔ سکندر لودی نے کہا میں نے تمھیں مختار کامل بنا کر بھیجا تھا اور جو کچھ تم نے کیا وہ بالکل درست و بجا ہے۔ میں حسابات دیکھ کر کیا کروں گا۔ چنانچہ بادشاہ نے حساب کے تمام کاغذات پانی میں ڈلوا دئے۔

خواص خاں بڑا معتمد علیہ اور نہایت وفادار و امین افسر تھا۔ اس کے مرنے کے بعد میاں بھورہ کو اس کی جگہ دی گئی۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۷۰ پر ملاحظہ ہو)

وقائع نگار سے دریافت کیا کہ اس قسم کے گناہ مجھ سے کتنی مرتبہ سرزد ہوئے ہیں جب اس نے بھی تفصیل لکھ دی تو بادشاہ نے حساب لگا کر حکم دیا کہ اس قدر سونا غرباء کو دیا جائے لیکن خزانۂ شاہی سے ایک پیسہ نہ لیا جائے۔ علماء کو اس پر حیرت ہوئی کہ بادشاہ کے پاس سلاطین و امراء کی طرف سے جو تحائف آتے تھے وہ علٰحدہ رکھے جاتے تھے اور ان کا سالانہ حساب طیار ہوتا تھا۔[1]

بادشاہ کا مرض بڑھتا جاتا تھا[2] لیکن وہ اُمور سلطنت سے غافل نہ تھا اور برابر اپنے فرائض انجام دیتا جاتا تھا آخر کار، ذی قعدہ ۹۲۳ھ (نومبر ۱۵۱۷ء) کو اس نے انتقال کیا۔

تاریخ خان جہاں لودی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو اس کا جنازہ دہلی گیا اور وہاں ایک باغ میں مدفون ہوا۔

سلطان ابراہیم

۹۲۳ھ سے ۹۳۲ھ تک
۱۵۱۷ء ۱۵۲۶ء

سلطان سکندر لودی نے اپنے دو بیٹے چھوڑے، جو حقیقی بھائی ایک ہی ماں سے تھے، بڑے کا نام ابراہیم تھا اور چھوٹے کا نام جلال خاں۔

چونکہ ابراہیم اپنی حسنِ صفات کی وجہ سے امراء کے طبقہ میں بہت مقبول تھا اور یوں بھی وہ بڑا بیٹا تھا اس لئے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۹)

لے میاں معروف فرملی بھی، عہدِ سکندر لودی کا نہایت مشہور امیر تھا، اپنے زہد و ورع، ہمت و شجاعت، فیاضی و سخاوت کی وجہ سے بہت ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ یہ سلطان لودی کے زمانہ سے لیکر اسلام شاہ کے عہد تک سیکڑوں لڑائیوں میں شریک رہا، لیکن کبھی زخمی نہیں ہوا اس نے تمام عمر کبھی کوئی انعام یا تحفہ بادشاہ کی طرف سے قبول نہیں کیا۔ جب شیر شاہ اور مال دیو کے درمیان جنگ ہوئی تو یہ بھی تلوار سے زخمی ہوا۔ اس وقت اسکی عمر ۱۰۰ سال کی تھی شیر شاہ نے اس کے زخمی ہونے کے بعد ۱۰ لاکھ تنکہ اسکے پاس بھیجے لیکن اس نے واپس کردئے اور کہلا بھیجا کہ میں نے آج تک کبھی سلطانی انعامات کو قبول نہیں کیا کیونکہ جو کچھ مجھے فی الحال ملتا ہے وہ بھی میرے خدمات سے زائد ہے رہا زخم کھانا سو اس کا معاوضہ میں کیا لوں گا جبکہ وہ صرف اللہ کی راہ میں بیٹھے حاصل کیا ہے۔

لے تاریخ داؤدی (الیٹ) ج ۴، ص ۴۰۰-۴۴۱ — ٹے مرض یہ تھا کہ تنفس میں دشواری تھی اور غذا وغیرہ ضیق نفس کی وجہ سے ترک ہو گئی تھی۔

سلطان سکندر لودی کی وفات پر وہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ تخت نشین کیا گیا[1]۔ لیکن یہ کہنا کہ تمام امراء سلطنت اس تخت نشینی پر دل سے رضامند تھے درست نہ ہوگا۔ کیونکہ اُن میں سے بعض ایسے بھی تھے جو سلطنت میں تفریق پیدا کر کے اپنی اغراض پوری کرنے کی غرض سے یا حقیقۃً ابراہیم سے برہم ہونے کی وجہ سے[2]، جلال خاں دوسرے بیٹے کے طرفدار تھے۔

جب ابراہیم تخت نشین ہوگیا تو انھیں امراء نے جو سلطان ابراہیم کی سلطنت کو زیادہ قوی دیکھنا گوارا نہ کر سکتے تھے یہ تجویز پیش کی کہ سلطنت کے دو حصے کر دئے جائیں۔ ایک حصہ آگرہ سے جونپور تک، جو سلطان ابراہیم کے قبضہ میں رہے اور دوسرا جونپور کا معہ اس کے اطراف کے، جو جلال خاں کو ملنا چاہئے۔ چنانچہ فوراً اس تجویز پر عمل ہوگیا اور جلال خاں کو جلال الدین کا لقب دیکر جونپور کی طرف روانہ کر دیا[3]۔

فرشتہ کا بیان ہے کہ جلال خاں کالپی میں تھا اور وہ وہیں سے جونپور روانہ ہوگیا اور مسندِ شاہی پر بیٹھ گیا۔ بہرحال جلال خاں آگرہ سے گیا ہو یا کالپی سے یہ امر متفق علیہ ہے کہ سلطنت کی تفریق ہوگئی۔ اور جونپور کا حصۂ سلطنت جلال خاں کے سپرد کر دیا گیا۔

اس کے بعد جب خان جہاں[4]، ریہری سے سلطان ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے ملامت کی کہ ایک سلطنت کے دو حصے کر دینا کسی طرح مناسب نہیں ہے، چنانچہ سلطان ابراہیم نے ہیبت خاں گرگ انداز[5] کو روانہ کیا کہ وہ کسی طرح لطایف الحیل سے جلال الدین کو لے آوے۔ مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ بمجبوراً نواحِ جونپور کے امراء و حکام کو ترغیب دی گئی کہ وہ جلال الدین کی اطاعت نہ کریں۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس سے سرتابی اختیار کی اور جلال الدین کو مجبوراً کالپی جانا پڑا۔ یہاں پہونچکر اس نے علانیہ مخالفت شروع کر دی اور اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کر دیا اسوقت اعظم ہمایوں سردار، کالنجر[6] کے محاصرہ میں مصروف تھا۔ جلال الدین نے اس کو اپنی بے بسی و بے کسی کے اظہار سے اپنی طرف مائل کر لیا اور یہ قلعۂ کالنجر کا محاصرہ چھوڑ کر جلال الدین سے مل گیا۔ اب جلال الدین کو تقویت پہونچی اور اعظم ہمایوں کے مشورہ سے جونپور کی طرف چلا۔ راستہ میں سلطان ابراہیم کے

---

[1] مخزنِ افاغنہ، تاریخ خان جہاں لودی میں تاریخ تخت نشینی ۸ ذیقعدہ ۹۲۳ھ تحریر ہے۔ اور تمام دیگر مورخین کا بھی یہی بیان ہے۔ البتہ احمد یادگار (تاریخ سلاطین افاغنہ کا مصنف) بجائے ۸ ذیقعدہ کے ۸ ذی الحجہ تحریر کرتا ہے جو غالباً درست نہیں ہے۔ کیونکہ سلطان سکندر لودی کی تاریخ وفات محقق طور سے ۷ ذی قعدہ کو وقوع میں آئی اور ظاہر ہے کہ اس کے ایک ماہ بعد رسم تاجپوشی ادا نہیں ہو سکتی بلکہ دوسرے ہی دن دوسرا بادشاہ تخت نشین ہوگیا ہوگا۔ [2] برہم ہونے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ابراہیم نے جانشین ہوتے ہی اپنے باپ دادا کے خلاف تمام افغان امراء کے ساتھ اپنا طرزِ عمل بدل دیا اور اُن کے ساتھ ایسا سلوک شروع کیا جو اخوانِ سلطنت کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ مثلاً یہ کہ دیگر عام وابستگان کی طرح انھیں بھی دست بستہ تخت کے سامنے کھڑا ہونے پر مجبور کیا۔ [3] سلاطین افاغنہ (الیٹ) ۵۔۸۔ [4] یہ نام فرشتہ، نام نظام الدین احمد اور ملائے بدایونی نے تحریر کیا ہے۔ احمد یادگار نے اعظم ہمایوں لودی اور خانخانان فرملی کا نام تحریر کیا ہے۔

[6] کالنجر تقسیم کے مطابق جلال الدین کے قبضہ میں تھا۔

مقرر کردہ حاکم اودھ (سعید خاں پسر مبارک خاں لودی) سے مقابلہ ہوا۔ یہ بھاگ کر کڑہ کی طرف چلا گیا اور سلطان ابراہیم کو تمام حالات کی اطلاع دی۔

یہ خبریں سنکر سلطان ابراہیم خود ۹۲۳ھ میں مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ قبل اس کے کہ بادشاہ وہاں تک پہونچتا، اعظم ہمایوں، جلال خاں سے منحرف ہوکر راستہ میں اس سے آکر مل گیا اور جلال خاں اپنے متعلقین کو کالپی میں چھوڑ کر تیس ہزار فوج کے ساتھ آگرہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ لیکن اسے اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ کالپی بھی مفتوح ہوگیا اور آگرہ پر بھی قبضہ نہ ہوسکا۔ ناچار یہ گوالیار گیا اور وہاں کے راجہ مان[1] سنگھ کی حمایت چاہی۔

شاہی افواج نے گوالیار کا محاصرہ کیا اور بادل گڑھ وغیرہ مسمار کرکے جلال الدین کو یہاں سے بھی بھاگ جانے پر مجبور کردیا۔

جلال خاں اب مالوہ گیا لیکن وہاں کے فرمانروا محمود خلجی نے کچھ زیادہ مدارات نہ کی تو وہ گڑھ کٹنگ کی طرف بھاگ نکلا جہاں گونڈوں نے اسے گرفتار کرکے سلطان ابراہیم لودی کے[2] پاس بھیجدیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ قلعۂ ہانسی میں قید کردیا جائے۔ لیکن وہاں پہونچنے سے قبل ہی راستہ میں اُسے قتل[3] کرادیا۔ اس کے بعد جب سلطان ابراہیم لودی ذرا اطمینان سے آگرہ میں بیٹھا تو اس کی بدگمانی اور نخوت بہت زیادہ بڑھ گئی اور انھیں امراء و ارکین کے ساتھ برا سلوک کرنے لگا جو حقیقتاً مدارِ سلطنت تھے۔ اعظم ہمایوں اور اس کے بیٹے فتح خاں کو بلاکر قید کردیا۔ میاں بھوا کو جو عہد سکندری کے مشہور امراء میں سے تھے، پابزنجیر کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغاوتیں رونما ہونے لگیں اور امراء بددل ہوگئے۔ دریا خاں بہار کے حاکم نے خودمختاری کا اعلان کردیا اور اس کے بیٹے محمد نے جو دریا خاں کے بعد جانشین ہوا اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کردیا۔

تمام امراء جو بادشاہ سے منحرف تھے محمد سے مل گئے اور اس طرح قریب ایک لاکھ سواروں نے سنبھل تک قبضہ کرلیا۔

اتفاق سے اس زمانہ میں دلاور خاں (دولت خاں لودی حاکم پنجاب کا بیٹا) آگرہ آیا اور بادشاہ کی برہمی کا حال اپنے باپ سے بیان کیا۔ یقیناً دلاور خاں بغاوت نہ کرتا اگر وہ بادشاہ کی بے وجہ برہمی سے خائف نہ ہوتا۔ اس نے مفر اسی میں دیکھا کہ وہ اس سے الگ ہوجائے۔ چنانچہ اس نے بھی بغاوت شروع کردی اور بابر کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔

اس کا نتیجہ پانی پت کی وہ مشہور لڑائی[4] تھی جس نے سلطان ابراہیم کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کرکے اور بابر کو

۱ؔ مان سنگھ نہایت بہادر راجہ تھا لیکن اتفاق سے جلال خاں کے پہونچنے پر وہ مرگیا اور اس کا بیٹا بکرماجیت جانشین ہوا۔

۲ؔ فرشتہ ۱۹۰-طبقات-۱۷۷- سلاطین افاغنہ (ایلیٹ) ۵-۱۲-

۳ؔ فرشتہ نے اس کا نام غازی خاں اور منتخب التواریخ میں خانخاناں لکھا ہے۔

۴ؔ چونکہ یہ جنگ بابر کا مشہور کارنامہ ہے اس لئے اس کی مفصل کیفیت اس کے حالات میں درج کی جائے گی۔

دہلی کا فرمانروا بنا کے ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء میں ہندوستان کی سلطنت چغتائیہ تیموریہ خاندان میں منتقل کردی۔

سلطان ابراہیم نے کل ۹ سال تک سلطنت کی (جس کو فرشتہ نے خدا جانے کس حساب سے بیس سال تحریر کیا ہے) اور اس کے دوران حکومت میں اگر کوئی خاص بات نظر آتی ہے تو وہ غیر معمولی ارزانی ہے۔

مصنف تاریخ داؤدی کا بیان ہے کہ سلطان بہرام کے عہد میں، غلہ، کپڑا اور تمام چیزیں ایسی ارزاں تھیں کہ اس سے قبل کبھی نظر نہیں آئیں۔ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں جو ارزانی تھی وہ جبر و سختی سے پیدا ہوئی تھی لیکن ابراہیم کے زمانہ میں پیداوار اس قدر کثرت سے ہوتی تھی کہ لوگ خود ارزاں فروخت کرنے پر مجبور تھے۔ سکندر لودی کے وقت میں بھی ارزانی بہت تھی لیکن نہ اس قدر۔ اس کے عہد میں ایک بہلولی سکہ[1] کا دس من غلہ آتا تھا، پانچ سیر گھی اور دس گز کپڑے کی قیمت بھی ایک بہلولی تھی۔ علاوہ ان کے اور تمام اشیاء کی ارزانی کا بھی یہی عالم تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بارش کی موزونی سے وہ چند غلہ پیدا ہونے لگا اور بادشاہ نے حکم دیدیا کہ لگان میں بجائے روپیہ کے غلہ وصول کیا جائے۔ جس نے سکہ کی قیمت کو گھٹا دیا اور امراء و جاگیر داروں کو مجبور کردیا کہ اپنے اپنے اقطاع کا غلہ نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کریں۔ ایک معزز آدمی معہ اپنے خاندان کے پانچ تنکہ ماہوار کی آمدنی میں نہایت امن و راحت سے زندگی بسر کرتا تھا اور اگر کوئی سوار[2] دہلی سے آگرہ تک کا سفر کرتا تو صرف ایک بہلولی سکہ اس کے، اس کے گھوڑے اور سائیس کے مصارف کے لئے کافی ہوتا تھا۔[3]

---

[1] تانبہ کا سکہ تقریباً پونے دو تولہ کے برابر۔

[2] سوار کی تنخواہ بیس سے تیس تنکہ تک تھی اور اس سے اُس عہد کی خوشحالی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

[3] تاریخ داؤدی (الیٹ)۔ ۴-۵،۴-۶،۴…

ہندوستان ۹۳۲ھ (۱۵۲۵ء) میں
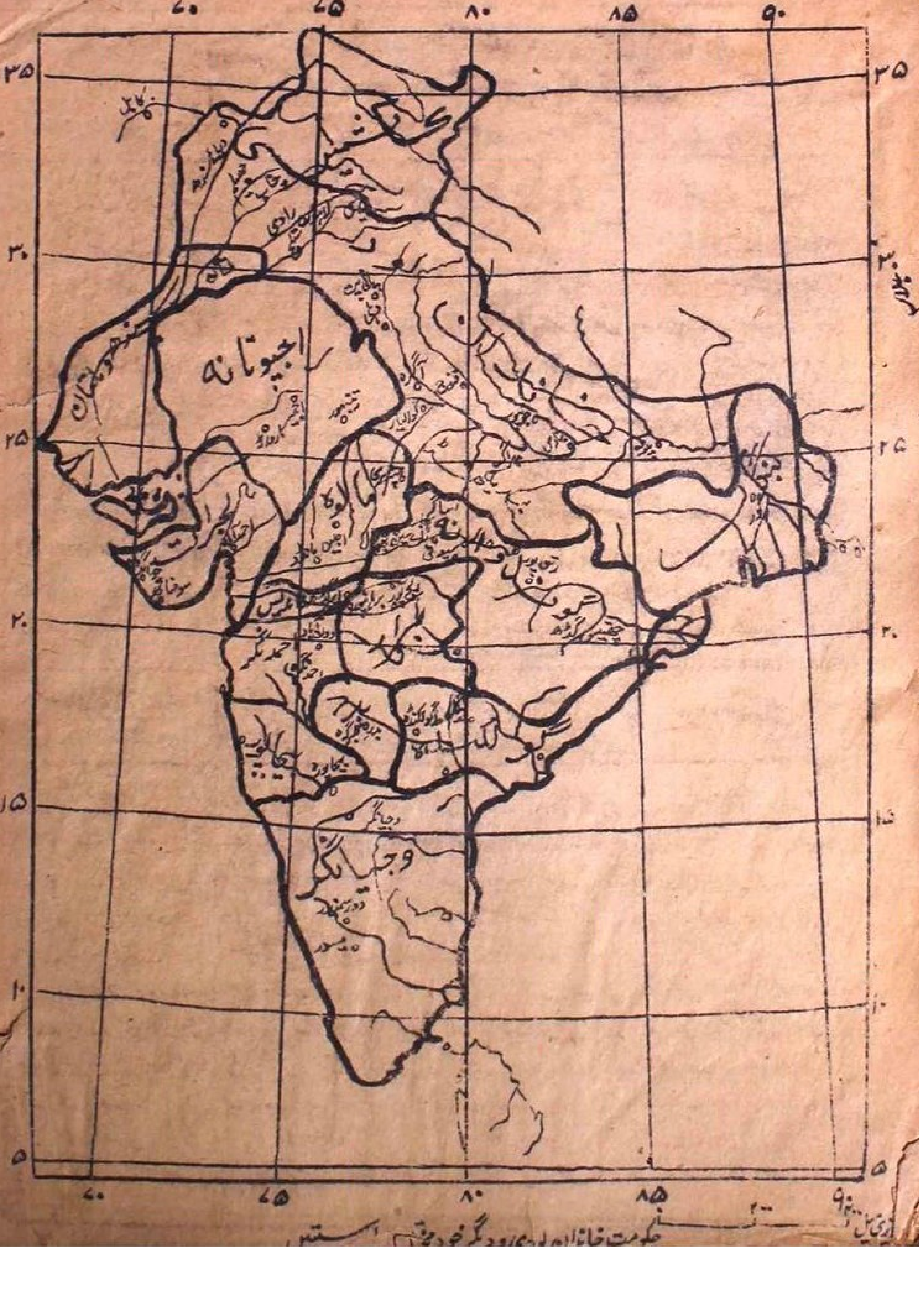
حملۂ بابر کے وقت